(سات افسانوں کا مجموعہ)

صادق الخیری دہلوی۔ ایم۔ اے۔

ناشر:۔ ساقی بک ڈپو دہلی

(محبوب المطابع برقی پریس دہلی)

طبع اول .. .. قیمت ڈیڑھ روپے

فہرستِ مضامین

صادق الخیری اور اُنکے افسانے

صادق الخیری کو میں اُس وقت سے جانتا ہوں جب سے وہ پیدا ہوئے ہیں۔ میرے اور اُن کے خاندان کے ڈانڈے دو پُشتوں پہلے مل جاتے ہیں۔ میرے دادا ڈپٹی نذیر احمد کے برادرِ نسبتی حافظ عبدالواحد اور حافظ عبدالواحد کے صاحبزادے علامہ راشد الخیری جن کے سپوت صادق الخیری ہیں۔ یوں صادق میرے بھائی ہیں اور چونکہ مجھ سے کم و بیش دس سال چھوٹے ہیں، اس لئے ان کا بچپن، ان کا لڑکپن اور ان کا شباب، سب میری آنکھوں کے سامنے ہے۔ ہمارے خاندان میں تعلیم سے زیادہ اہمیت تربیت کو دی جاتی ہے صادق الخیری کی تربیت بھی اس اصول پر ہوئی ہے کہ کھلاؤ سونے کا نوالہ اور دیکھو شیر کی نگاہ۔

دلّی کے شرفاء کے خاندانوں میں یہی اصول کارفرما تھا۔ چچا ابّا (علامہ راشد الخیری) بیحد رقیق القلب بزرگ تھے۔ یہی وجہ ہے کہ غم و اندوہ اُن کے قلم کا خاصہ بن گیا تھا۔ وہ ادب کے آبدار موتی لُٹاتے تھے مگر غور سے دیکھا جائے تو آنسوؤں کی لڑیاں بناتے تھے، جن میں درد کی پرچھائیاں اور خونِ دل کی رنگینیاں جھلکتی تھیں۔ اوروں کا دُکھ اُن کے دل کا درد بن جاتا تھا۔ یہ درد آنسو بن کر

علاّمہ کے قلم سے ٹپکتا تھا اور پڑھنے والوں کی آنکھوں میں جگہ پاتا تھا۔ اُن کا دل گداز ہو گیا تھا۔ اپنی اولاد کے عاشق تھے۔ اب سے دُور صادق الخیری بیمار پڑے تو ساری ساری رات سرہانے بیٹھے رہتے۔ رات آنکھوں ہی آنکھوں میں کٹ جاتی اور پھر دن بھی بیٹھے ہی بیٹھے گذر جاتا۔ صادق الخیری کی آنکھ لگ گئی۔ اب مولانا پریشان ہیں کہ ذرا بھی کھٹکا نہ ہونے پائے۔ گھنٹے پر نظر ہے کہ اس کے باج سے آنکھ نہ کھل جائے۔ باج کا وقت ہوا اور مولانا نے گھنٹہ کھولکر ننھی ہتھوڑی اور نقرہ تار کے بیچ میں اپنی اُنگشتِ شہادت رکھدی۔ اس سے فارغ ہوئے تو پھر پٹی سے آلگے۔ شاید ہی کوئی باپ اپنی اولاد پر یوں پروانہ وار نثار ہوتا ہو۔ مگر اس کے باوجود کیا مجال جو کوئی بیہودگی کا تو ذکر ہی کیا کوئی بچہ کسی قسم کی بدتمیزی اُن کے سامنے کرے۔ کہاں کا مارنا پیٹنا ذرا نظر جما کر دیکھا اور بچے کا دم نکلا۔ اس چشم نمائی پر ہزار تعزیریں قربان۔ غضب کا سلیقہ تھا اِن بزرگوں کو۔ کیا ستم تھا ان کی تربیت کا کہ کُندن بنا دیتے تھے۔ صادق الخیری نے اس ماحول میں تربیت پائی۔ اور اپنے گھر کی بابرکت فضا سے کبھی الگ نہیں ہوئے۔ صرف گذشتہ سال چند مہینے بسلسلۂ ملازمت بمبئی میں رہنا پڑا اور اب پھر بفضلہ دلّی میں ہیں اور اپنے گھر میں۔ ماحول کا اثر انسانی فطرت کی تشکیل میں توارث سے بھی اہم تر جزو ہوتا ہے۔ گھر میں یوں ادب ان کی گھٹی میں پڑا ہے اور عمدہ تربیت سونے پر سہاگہ ہو گئی۔ اعلیٰ تعلیم نے اُن کے فطری جوہر کو جلا دی اور ان کے حسنِ مذاق اور مذاقِ حسن کو نکھارا۔

صادق الخیری نے ایک عظیم المرتبت انشا پرداز کے گھر میں جنم لیا، اور ہوش سنبھالا تو علم و ادب کے گہوارے میں۔ مجھے ان کی تربیت کے متعلق

اِس لئے مختصراً کچھ کہنا پڑا کہ علمی تربیت کا جو عمدہ اثر طبیعت میں رچ جاتا ہے اُسکا مظاہرہ انسان کے اقوال و افعال سے ہوتا رہتا ہے۔ اِسی کا عکس ادیب و انشا پرداز کی تحریر میں دکھائی دیتا ہے۔ صادق الخیری کے افسانوں میں جو ایک خاص نوع کی شائستگی پائی جاتی ہے وہ اِسی شائستہ تربیت کا نتیجہ ہے۔ اور میں سمجھتا ہوں کہ یہ شائستگی خیال و شائستگی بیان و شائستگی زبان ہی انہیں موجودہ دور کے مشہور افسانہ نگاروں میں ممتاز و مفتخر کرتی ہے۔ ورنہ کہانیاں لکھنے والے ممکن ہے کہ تکنیک کے اعتبار سے یا ترقی پسندی کے لحاظ سے صادق الخیری سے بازی لیجائیں مگر ستھرے پن اور نفاست میں صادق الخیری اب تک منفرد ہیں۔ یہ ان کا خاص میدان ہے اور یہاں کوئی افسانہ نگار ان سے بازی نہیں لیجا سکا۔

یاد ش بخیر کوئی دس سال اُدھر کی بات ہے کہ ہمارے ملک میں ایک نئی ادبی تحریک کا آغاز ہوا یعنی ادب میں ترقی پسندی۔ اسکی دبی دبی سی چنگاریاں ہر جدید تعلیم یافتہ ادیب کی خاکستر خیال میں دبک رہی تھیں لیکن انہیں ہوا دیکر شعلہ سی تحریک نے بنایا ترقی پ.س.ی کی تحریک قت کی پیداوار تھی۔ ہمارا ادب ایک محدود دائرے میں گھوم رہا تھا۔ ربع صدی سے اس میں کسی قسم کی تبدیلی نہیں ہوئی تھی مصنفین کے سوچ بچار پر جمود طاری تھا اور شاید وہ آنکھیں بند کر کے بیٹھ رہا تھا۔ حُسن و عشق کی خیالی کہانیوں نے لکھنے والوں کے ساتھ پڑھنے والوں کے دلوں پر بھی اپنا قبضہ جما لیا تھا۔ زندگی کے اہم بنیادی مسائل سے مجرمانہ چشم پوشی کی جا رہی تھی۔ ادب لہو و لعب اور جلب تعیش کا آلہ کار بنا ہوا تھا۔ تصوری محبوبوں کے من گھڑت قصے عشق و ہوس کے دل لُبھانے والی فرضی کہانیاں، ٹیگور کی تہلکہ روحانیت کے نقلی چربے، یہ تھی ہماری نثر کی کُل پونجی شعر و شاعری کا حال اس سے

زبوں تر تھا۔ مختصر یہ کہ رسمی غزل نے پڑھے لکھے لوگوں کے ساتھ ساتھ اَن پڑھ جاہلوں کو بھی شاعر کا خلعتِ فاخرہ پہنا دیا تھا۔ جو جتنا حقیقت سے گریز کرتا اتنا ہی اُسکا مرتبہ ادب و شعر میں بلند سمجھا جاتا۔ ترقی پسندی کی تحریک کی صورت میں اس جمود و تعطّل کا ردِ عمل شروع ہوا۔ سجاد ظہیر اور ان کے رُفقا نے اس نئی تحریک کی وضاحت کی اور اسے ہر دلعزیز بنانے میں ساعی ہوئے۔ ترقی پسندی کی تحریک ہندوستان کی سب زبانوں میں ایک ساتھ شروع ہوئی مگر اُردو نے اِس باب میں بھی جذب و قبول کے سارے درجے چشمِ زدن میں طے کر لئے اور دیکھتے ہی دیکھتے کچھ سے کچھ ہو گئی۔ اس نئے خون سے اُردو کا افسانوی ادب سال ڈیڑھ سال ہی میں تندرست دتوانا ہو گیا۔ یہ تحریک ایک ایسی نشتی تھی جس نے فرضی حُسن و عشق کے لتّے اُتار دیئے۔ یہ سیم سیم کا وہ منتر تھا جس نے ادیبوں کے لئے زندگی کے دروازے کھول دیئے۔ زندگی کے خوشنما بھڑکیلے لباس تار تار ہو کر گر پڑے۔ زندگی اپنی مکمل عریانی میں نظر آ رہی تھی اور اس کے جلو میں بھوک، افلاس، ظالم مظلوم، آقا غلام، کسان مزدور، غرض ایک بگڑا ہوا نظام اور دُکھ کے بوجھوں سے تھکی ہوئی انسانیت سسکتی دکھائی دے رہی تھی۔ جدید تحریک نے ادب کو صرف اس دُکھیاری زندگی کا آئینہ دار ہی نہیں بنایا بلکہ اسے ایک زبردست حربہ بھی بنا دیا۔ جس نے پڑھنے والوں کے خیالی آئینہ خانے پاش پاش کر دیئے اور انہیں چونکا کر سنگین حقیقتوں سے دوچار کر دیا۔ پُرانی قدریں بدل گئیں اور پُرانے سانچے ٹوٹ گئے ادیبوں کے ساتھ ساتھ پڑھنے والوں کے سوچنے کے طریقے بھی بدل گئے اور ایک نئے ادب نے جنم لیا جس کا نام ترقی پسند ادب رکھا گیا۔ مگر جیسا کہ ہر تحریک کی ابتدائی دور میں ہوتا ہے جوش اور ولولہ اپنی حدود میں مُقیّد نہ رہ سکا۔ یہ ادبی طوفان بھی اپنے ساحلوں کو توڑ کر بے قابو ہو گیا اور چشمِ تماشہ حیرتیٔ جلوہ بے باک

بن گئی۔ مگر جلدی ہی اِس کا اُتار بھی شروع ہو گیا اور یہ محیطِ بے کراں آہستہ آہستہ
شرمندہ ساحل ہونے لگا اور رفتہ رفتہ اس کے دھاروں نے ایک واضح اور صاف
شکل اختیار کر لی جو ادب کے گدلے پانیوں میں اپنی منزلِ مقصود کی طرف شفاف
لہروں کا روپ دھارے سہانی چال سے بڑھ رہے ہیں۔

ترقی پسند تحریک کا تذکرہ مختصراً مجھے یوں کرنا پڑا کہ صحیح معنوں میں صادق الخیری
اِسی تحریک کے ساتھ میدانِ ادب میں آئے۔ وہ اس سے پہلے بھی جب اسکول میں پڑھتے
تھے تو گیتا نجلی کے تتبع میں ادب پارے لکھا کرتے تھے۔ سب سے پہلے جب دلّی میں ادارہ
ساقی کی جانب سے ترقی پسند مصنّفین کی انجمن قائم ہوئی تو صادق الخیری اُس کے
سرگرم رُکن تھے اور ان کی موجودہ افسانہ نگاری کی بُنیاد انہی ٹھوس اصولوں پر
رکھی گئی۔ اب تک انہوں نے جو افسانے لکھے ہیں اُن کی تعداد سینکڑوں پر ہے
اور ان کے منتخب افسانوں کے کئی مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ لیکن فلسفہ میں ایم اے
کی ڈگری لینے اور سلسلۂ ملازمت میں آنے کے بعد انہوں نے جو افسانے لکھے
اُن میں ایک خاص نوع کا سنجیدہ تفکّر جھلکتا ہے۔ کالج کی زندگی میں اُنہیں
جذباتیت اور رومانیت پر زیادہ تکیہ کرنا پڑا۔ کالج کے بعد اُنہیں زندگی کو بچشمِ خود
دیکھنے کے اچھے مواقع ملے خصوصاً جب اُنہیں بسلسلۂ ملازمت بمبئی جانا پڑا
اور گھر کے ماحول سے یکسر الگ رہ کر ایک بالکل ہی نئی دُنیا میں کچھ عرصہ گذارنا
پڑا۔ ماحول کی اِس تبدیلی نے ان کے تجربات میں ایک نمایاں تبدیلی کی، ان کے جدید
تاثرات نے ایک صنّاعانہ پیرایۂ بیان اختیار کیا۔ بمبئی کے ماحول سے متاثر ہو کر انہوں
نے پانچ افسانے لکھے ہیں جو اس مجموعہ میں شریک ہیں۔ "دھنک" اور "چرائی ہوئی
ڈائری"، یہ دونوں افسانے تلخ حقیقتوں کے آئینہ دار ہیں اور ترقی پسند ادب
کے صحیح مفہوم کی ترجمانی کرتے ہیں۔ باقی پانچ افسانوں کے پس منظر کیلئے افسانہ نگار

نے پانچ مختلف جزیروں کو پسند کیا ہے جو بمبئی کے نواح میں بتائے گئے ہیں لیکن فی الحقیقت ان کا وجود صرف افسانہ نگار کے تخیل میں ہے مگر انہیں اس طرح محسوس کیا اور کرایا گیا ہے کہ یہ خواب کے جزیرے اُفق خیال پہ اپنی پوری رعنائیوں کے ساتھ اُبھر آئے ہیں اور محسوس حقیقتیں بن گئے ہیں۔ ان جزیروں میں نادرِ فطرت نے اپنے تمام خزانے لُٹا دیئے ہیں اور تھکی ہوئی انسانیت کے لئے آرام وسکون کی آغوش وا کردی ہے۔ شاعر کی طرح افسانہ نگار کا فرض بھی یہ ہے کہ زندگی کے حسین و بیش قیمت تاثرات و تجربات کو موثر پیرایہ میں پیش کرے۔ صادق الخیری نے بمبئی کے قرب وجوار کے جزیروں میں جو کچھ دیکھا اُسے شدت سے محسوس کیا۔ جزیروں کی حسین فطرت اور اس کی گود میں پلنے والی انسانیت کے مطالعہ نے ان کے تخیل کو ایک نئی بیداری دی، ایک نئی روشنی دی، جسے ان کی تجزیاتی اُفتادِ طبع کے منشور نے دھنک کی رنگینی میں تبدیل کر دیا۔ اگر وہ صرف ایک عکاس کے فرائض انجام دیتے تو یہ افسانے بالکل بے رنگ خاکے بن کر رہ جاتے۔ مگر انہوں نے ایک آرٹسٹ کی طرح اس نئی زندگی کے خاکوں میں لطیف تاثرات کے رنگ بکھرے ہیں۔ انہوں نے گویا ایک ہفت رنگ کمند پھینکی ہے جو تخیل کی بلند پروازیوں کو اسیر کرتی ہے۔ اور ایک ایسی دُنیا میں پہنچا دیتی ہے جہاں پریشان دماغوں کو راحت وسکون ملتا ہے اور جہاں سرخوشی کا سکہ چلتا ہے۔ ممکن ہے کہ ہمارے آج کل کے حقیقت پسند ادیب اس نوع کے ادب کو زندگی سے فرار قرار دیکر اسے افادی اعتبار سے ساقط ٹھہرائیں لیکن "افادہ" کا کوئی ایک مقررہ معیار نہیں ہے۔ یہ ایک نسبتی اصطلاح ہے جس کا دارومدار ماحول پر ہے۔ افادہ جسمانی بھی ہوتا ہے اور روحانی بھی۔ افسانے کے وسیع موضوع میں دونوں شامل ہیں۔

زندگی کے بنیادی مسائل مثلاً بھوک، شہوت وغیرہ اہمیت ضرور رکھتے ہیں اور ان کی تسکین بھی ضروری ہے لیکن انسان کو دوسرے حیوانوں سے جو چیز ممیّز کرتی وہ روحانی یا دماغی ضرورتوں کی تسکین اور ترقی ہے۔ انسان کی سب سے اہم ضرورت حیوانی ضرورتوں کی تسکین نہیں دماغی ضرورتوں کی تسکین و ترقی ہے۔ اِس اعتبار سے وہی ادب بیش قیمت ہے جو دماغ کو راحت پہونچائے اور اُسے بلندی کی طرف اُبھالے۔ صادق الخیری نے جزیروں کے متعلق جو پانچ افسانے لکھے ہیں اِن سب میں حُسن کاری کو بڑا دخل ہے۔ صناعت کا مقصد فطرت کا حُسن کارانہ اظہار کرنا ہے۔ صناعت ہمارے ذوقِ جمال کو تسکین و مسرت سے ہم آغوش کرتی ہے۔ یہی اس کی افادیت کا ثبوت ہے۔ صادق الخیری نے بمبئی کے نزدیک جزیروں میں جو کچھ دیکھا افسانہ نگار کی باریک بیں نظر سے دیکھا اور انہیں دیکھکر جو تاثرات پیدا ہوئے اُنہیں اپنے ذہن میں صحت مند نشو ونما دی اور اُس انفرادیت کے ساتھ جو ایک آرٹسٹ کا خاصۂ طبعی ہوتی ہے، خوشنما افسانوں کے قالب میں ڈھالتے چلے گئے، خوشنما ہونا میرے نزدیک ایک وصف ہی، ایک خوبی ہے کیونکہ اس سے بھی ذہنی تسکین و مسرت میں اضافہ ہوتا ہے۔ بہتے ہوئے دریا کا منظر بھی خوشنما ہوتا ہے لیکن کٹورے کی طرح چھلکتا حوض زیادہ خوشنما ہوتا ہے۔ شراب مٹی کے کلھڑے میں پی جائے چاہے ساغرِ بلوریں، اس کے ذائقہ میں کوئی فرق نہ آئیگا لیکن دونوں صورتوں میں جو فرق ہے محتاجِ بیان نہیں۔

فن کے اعتبار سے آجکل کے افسانے کا یہ فن ہے کہ اِس کا کوئی فن نہیں ہے۔ پُرانے معیار اور اقدار ساقط سمجھی جاتی ہیں۔ مادّی زندگی کی بھدّی تا سے بھدّی تصویروں سے لیکن نازک سے نازک ذہنی تحریکات کی عکاسی تک

موضوعِ افسانہ ہیں۔ لیکن تشکیل و ترتیب، ماحول، کردار نگاری، تجزیہ نفسی، ذہنِ لاشعور کی تشریح اور اس کے منطقی نتائج یہ سب صادق الخیری کے افسانوں کی منضبط کڑیاں ہیں جو انہیں موجودہ دور کے افسانہ نگاروں سے ممتاز کرتی ہیں اور یہ ایک ایسا امتیاز خصوصی ہے جس پر میں سمجھتا ہوں کہ اگر وہ ناز کریں تو بیجا نہ ہوگا۔

انشا پرداز کے لئے ضروری ہے کہ وہ الفاظ کی صلاحیت، وسعت اور قوت سے پوری طرح واقف ہو۔ کسی ایک مفہوم کو ادا کرنے کے لئے ہر زبان میں صرف ایک ہی لفظ ہوتا ہے اور اس صحیح لفظ کا انتخاب ہی ادیب کو انشا پرداز بناتا ہے۔ بیچے تُلے الفاظ ہی انشا کی جان ہوتے ہیں۔ الفاظ کی شکل و صورت ہوتی ہے، بعض لفظ حسین ہوتے ہیں بعض بدنما۔ الفاظ کا وزن ہوتا ہے۔ بعض لفظ بھاری بھرکم ہوتے ہیں اور بعض اوچھے، الفاظ میں صوتی اثر ہوتا ہے، بعض لفظوں میں موسیقی ہوتی ہے اور بعض میں جھنکار۔ غرض لفظ ایک بہت بڑی قوت ہے۔ اتنی بڑی کہ انجیل کے مطابق "سب سے پہلے لفظ تھا"۔ یعنی جب کچھ نہ تھا تو "لفظ" تھا اور اب جو کچھ بھی ہے سب لفظ کا کرشمہ ہے۔ لفظ کی اہمیت کا اندازہ ہر انشا پرداز کو ہونا چاہیئے اور اس کا انتخاب ایسا ہو کہ نگینہ کی طرح مفہوم کی انگشتری میں بیٹھے۔ صادق الخیری کی عبارت دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے اِس راز کو پا لیا ہے اور اپنے طرزِ تحریر کا اسے جوہر خاص بنا لیا ہے۔ انہی جوہر پاروں سے ان کی رنگینیٔ بیان عبارت ہے لطیف تخیّل میں جب الفاظ کا جادو بکھر جاتے تو پڑھنے والے کے ذہن میں ایک دھنک کی سی رنگینی پھیل جاتی ہے۔ ملاحظہ ہو:۔

اُس نے پھاٹک پر کہنیاں ٹکا دیں اور مغرب کی طرف دیکھا تیسرا پہر

شروع ہو چکا تھا۔ بھیگے ہوئے درختوں پر سورج کی سنہری کرنیں ناچ رہی تھیں۔ اللہ کا وسیع اور نیلگوں آسمان شفق زار بنا ہوا تھا اور اُس کے ایک جانب صاف ستھرے نازک سے آنچل پر دھنک کِھلی ہوئی تھی۔ ایک کمان کی مانند، جس کی گولائی اور دلفریبی نے اُسے بے حد مسحور کیا۔ اور پھر اس میں رنگینیاں بھی تو تھیں جیسے بے شمار حسین وجمیل پریوں کو انواع واقسام کے رنگین وریشمین لباس پہنا کر اُن نصف دائروں میں آراستہ کر دیا گیا ہے۔

ایک دو تین...... وہ ان رنگ برنگے دائروں کو گننے لگا۔ بنفشی، اودا، نیلا، سبز، زرد، نارنجی، اور سُرخ...... اور اس کا خیال ان خوشرنگ لہریوں سے چند لمحات یونہی کھیلتا رہا کہ دفعتاً اُسے بچپن کی ایک بات یاد آ ئی۔ مینہ رُکنے کے بعد دھنک نکل آئے تو پھر ڈراؤنی گھٹائیں نہیں اُٹھتیں، اندھیرا نہیں چھاتا۔ بارش بھی بے انتہا نہیں ہوتی۔ اور اب تو بچے بھی اپنے اپنے گھروں سے باہر نکل کر کیچڑ اور پانی سے کھیلنے لگے تھے۔ اُجالا پھیل گیا تھا، اور دھنک نکل آئی تھی! بچپن کی کہاوت سچ ہی ہے۔ اب سیلاب نہیں آئیگا۔ بارش طوفان بپا نہیں کرے گی، اور اُس نے اپنے دل میں کہا کاش یہ دھنک میرے لئے نیک شگون ہو۔ میری زندگی بھی تو آج کے دن کی طرح ہی، میری مسرتوں اور آرزوؤں پر تو گھٹائیں چھائی ہوئی ہیں۔ کیا خبر اب دھنک نکلنے والی ہو، ایسی ہی خوشنما اور جلوہ زا، جیسے وہ سامنے! اور پھر میری زندگی کا آسمان صاف ستھرا ہو جائے، بادل اور تاریکی نہ رہیں۔ (دھنک)

جدید افسانوی ادب کے متعلق خود ان افسانوں کے مصنف کا وہی خیال ہے۔ جو اُس ڈائری لکھنے والے ادیب کا ہے جس کی ڈائری کے چند ورق چرا کر اس مجموعہ میں پیش کیے گئے ہیں۔ ان کی صداقت میں شاید ہی کسی صاحب ذوق کو شبہ ہو:-

آجکل جدید رجحانات اور نئے نئے قسم کے افسانے ہماری ادبیات میں اضافہ کر رہے ہیں۔ یہ زبان اور لٹریچر کے حق میں نیک فال ہے لیکن "ترقی پسند" افسانوں کے نام سے جس نوع کا ادب پیش کیا جا رہا ہے اُسے مد نظر رکھتے ہوئے کم از کم میں تو "ترقی پسند افسانہ نگار" کہلانا ہرگز گوارا نہیں کرتا۔ ان افسانوں کا بنیادی خیال محض جنسی تعلقات اور نفسانیت ہے اور یہ ترقی پسند افسانہ نگار اسی ایک خیال کو پھیر پھیر کر اور اس پر طرح طرح کے پلاٹ بنا کر پیش کیے جاتے ہیں۔ اس پہ طرّہ یہ کہ ان کے ہاں فحش نویسی کی حد تک بڑھی ہوئی عریانی کا خاص اہتمام کیا جاتا ہے۔ اور چونکہ عریاں افسانے ہمارے عوام میں قدرتی طور پر مقبول ہوتے ہیں اس لئے یہ سیلاب بڑھتا ہی چلا جاتا ہے۔ مگر اس قسم کی چیزوں کو "ترقی پسند ادب" کہہ کر ادب کو کیوں بدنام اور مجروح کیا جائے آخر لٹریچر اور کوک شاستر میں کچھ تو امتیاز ہونا چاہیے۔ ادب ایک نازک فن ہے۔ اس کی حدود سے ذرا تجاوز کیا اور اس کی پاکیزگی جاتی رہی۔ لیکن ہمارے جدید افسانہ نگار ان نزاکتوں اور فنی لوازمات کو نہیں سمجھتے یا سمجھنا نہیں چاہتے۔ (چرائی ہوئی ڈائری)

ماحول کی عکاسی یا منظر کشی صادق الخیری نے پیش نظر افسانوں میں بڑی صداقت سے موثر پیرایہ میں کی ہے۔ ماحول بدلتا رہتا ہے اور صناع کی دماغی کیفیات بھی ایک سی نہیں رہتیں۔ صناعت کا عمدہ نمونہ اُس وقت وجود میں آتا ہے جب کسی خاص ماحول

نے کسی خاص کیفیت کے تحت صنّاع کے ذہن کو متاثر کیا ہو اور اس نئے تجربہ کو صنّاع نے
اس طرح پیش کیا ہو کہ جو مسرّت اسے خود حاصل ہوئی تھی وہی مسرت وہ دوسروں تک
بھی پہونچادے۔ ذیل کا حسین منظر دیکھئے کتنا سرور وسکون حاصل ہوتا ہے۔

نشیب میں جانے والی پگڈنڈی چراگاہوں اور مرغزاروں میں سے ہوتی ہوئی
گذرتی تھی۔ جگہ جگہ دستِ قدرت کے سجائے ہوئے کنج اور فردوسِ نظر باغیچے
عالمِ سرشاری میں جھوم رہے تھے۔ دُور دُور تک صدہا قسم کے حیات
افروز درخت اور وضع وضع کے رنگ برنگے پھول اور کلیاں آرائشِ جمال
میں مصروف تھیں جن میں بار آور شگوفے بھی شامل تھے اور ایسے بھی جنکا
مقصدِ نمودِ محض اظہارِ حُسن اور عطر بیزی تھا۔ برگ وگل کے اس تموج میں
وہ بیلیں بھی شریک تھیں جن کی نازک پتّیوں پر حسین وجمیل تیتریاں
ناچ رہی تھیں۔ جب وہ ایک گُل سے دوسرے گل، ایک کلی سے دوسری
کلی اور ایک پودے سے دوسرے پودے پر جاکر بیٹھتیں تو اُن کے پَر ہوا
میں اس طرح تھرتھرانے لگتے تھے جیسے وہ خود رقص کرتا ہوا پھول بن گئی
ہیں، ایسا پھول جس کی پنکھڑیاں بارِ شبنم سے لرز رہی ہوں۔ نسیم
صبح بھی اس وقت اس طرح نرم رفتاری سے چل رہی تھی گویا اُسکی
چال خمار آلودہ ہے۔ اس کے قدم لغزیدہ ہیں اور وہ ہزارہا قسم کی خوشبوؤں
میں ڈوبی ہوئی رقص کُناں ہے۔ رنگ وبو کے اس بے پناہ ہجوم میں
وہ پگڈنڈی کبھی یوں بل کھاجاتی تھی جیسے کسی کافر ادا کی کمر اندازِ
محبوبانہ سے لچک جائے اور کبھی اس طرح سیدھی دُور دُور تک نظر
آنے لگتی جیسے تاروں بھرے آسمان میں کہکشاں نکل آئی ہو۔
کہیں کہیں شاما یا کوئی اور ننھی منّی خوبصورت چڑیا اکیلی مل جاتی

جو پتوں کے جھرمٹ میں چھپی ہوئی اپنی باریک سُریلی سیٹیاں بجاتی ہوتی ورنہ بالعموم چمن زادیاں اپنی اپنی ٹولیوں میں ایک ساتھ مل کر فضا میں شور موسیقی بپا کر رہی تھیں۔ (نشیمن)

جزیروں کی کہانیوں میں آخری طویل مختصر افسانہ "نشیمن" میری رائے میں صادق الخیری کا شاہکار ہے۔ اس میں اُن کا کمال فن نظر آتا ہے۔ یہ ایک طویل رومان ہے سستی رومانیت سے عاری۔ یہ افسانہ اپنی انفرادیت کی وجہ سے آرٹ کا اچھوتا نمونہ ہے۔ یہ ایک خوش آئند نغمہ ہے جو زندگی کے ساز سے ایک خاص سوز کے ساتھ بلند ہوا ہے۔ اِس نغمہ میں راگ کی جملہ نزاکتیں اور باریکیاں نمایاں ہیں۔ مگر یہ راگ دیپک ہے جس کے سُروں سے شعلے لپکتے ہیں اور موسیقار کو جلا کر بھسم کر دیتے ہیں۔ یہ افسانہ سوزِ عشق کا ہے جس نے عشق کے ساتھ حُسن کو بھی جلا کر خاکستر کر دیا۔ مگر یہ جلی ہوئی خاک غبارِ راہ نہیں بنتی، سُرمہ چشم بنتی ہے۔ اور بصارت کے ساتھ بصیرت کو بھی نور بخشتی ہے۔

افسوس ہے کہ قلت گنجائش کی وجہ سے میں صادق الخیری کے اس شاہکار اور دوسرے افسانوں کے متعلق تفصیل سے نہیں لکھ سکتا۔ تاہم یہ چند اشارے ہیں جن سے اُمید ہے کہ اِن افسانوں اور افسانہ نگار کو سمجھنے میں آپ کو کچھ مدد مل سکے گی۔

دہلی
۱۰ر جون ۱۹۴۳ء

شاہد احمد دہلوی

دھنک

صبح کاذب سے آسمان پر بادل چھائے ہوئے تھے اور دم بدم اُن کی سیاہی بڑھتی جارہی تھی، یہاں تک کہ طلوعِ آفتاب کی جھلکیاں بھی کالی گھٹاؤں کے پردے میں روپوش ہوگئیں۔ پہلے پہل مینہ رقاصہ کے گھنگروؤں کی طرح رم جھم رم جھم برستا رہا، لیکن تھوڑی دیر بعد تیز ہوگیا، اتنا تیز کہ جل تھل بھر گئے، ندی نالے بہہ نکلے اور کچے مکانوں کے گرنے کی آوازیں آنے لگیں۔ اس پر ستم یہ کہ گھٹا ٹوپ اندھیرا، بادل کی کڑک اور بجلی کی چمک۔ غرض جوں جوں دن کی عمر بڑھتی جاتی، دھونتال پانی اور تاریکی میں اضافہ ہوتا جاتا تھا۔ پھر یکایک موسم میں تبدیلی ہوگئی، گویا قادرِ مطلق نے کوئی کل موڑ دی تھی۔ بارش رُک گئی، بادل چھٹ گئے اور سارے گاؤں میں اجالا پھیل گیا۔

اُس نے پھاٹک پر کہنیاں ٹکا دیں اور مغرب کی طرف دیکھا۔ تیسرا پہر شروع ہوچکا تھا۔ بھیگے ہوئے درختوں پر سورج کی سنہری کرنیں ناچ رہی تھیں۔ اللہ کا وسیع و نیلگوں آسمان شفق زار بنا ہوا تھا اور اُس کے ایک جانب صاف ستھرے نازک سے آنچل پر دھنک کھلی ہوئی تھی۔ ایک کمان کی مانند، جس کی گولائی اور دلفریبی نے اُسے بے حد مسحور کیا۔ اور پھر اس میں رنگینیاں بھی تو تھیں، جیسے بے شمار حسین و جمیل پریوں کو انواع و اقسام کے رنگین و ریشمین لباس پہنا کر اُن نصف دائروں میں آراستہ کر دیا گیا ہے۔

ایک، دو، تین...... وہ ان رنگ برنگے دائروں کو گننے لگا۔ بنفشی، اودا، نیلا، سبز، زرد، نارنجی، اور سرخ...... اور اس کا خیال ان خوشرنگ لہریوں سے چند لمحات یونہی کھیلتا رہا کہ دفعتاً اُسے بچپن کی ایک بات یاد آئی۔ مینہ رکنے کے بعد دھنک نکل آئے تو پھر ڈراؤنی گھٹائیں نہیں اُٹھتیں، اندھیرا نہیں چھاتا۔ بارش بھی بے انتہا نہیں ہوتی! اور اب تو بچے بھی اپنے اپنے گھروں سے باہر نکل کر کیچڑ اور پانی سے کھیلنے لگے تھے۔ اُجالا پھیل گیا تھا اور دھنک نکل آئی تھی! بچپن کی کہاوت سچ ہی ہے۔ اب سیلاب نہیں آئیگا۔ بارش طوفان بپا نہیں کرے گی، اور اُس نے اپنے دل میں کہا کاش یہ دھنک میرے لئے نیک شگون ہو! میری زندگی بھی تو آج کے دن کی طرح ہے۔ میری مسرتوں اور آرزوؤں پر بھی تو گھٹائیں چھائی ہوئی ہیں۔ کیا خبر، اب دھنک نکلنے والی ہو، ایسی ہی خوشنما اور جلوہ زا، جیسے وہ سامنے! اور پھر میری زندگی کا آسمان صاف ستھرا ہو جائے، بادل اور تاریکی نہ رہیں۔

۱

اس کا نام ملک راج سانیال ہے اور یہ جسٹس تلک راج سانیال کا لڑکا ہے، جنکی کبھی متھرا میں بڑی شہرت تھی۔ اور لوگ ان کی ایمانداری اور شرافت کی وجہ سے بڑی عزت کرتے تھے۔ جسٹس مرحوم کی کوٹھی اسٹیشن کے قریب تھی۔ ریلوں کے ہنگامے دن بھر میں بیسیوں مرتبہ نظر کے سامنے ہوا کرتے تھے! اور ملک راج کو ان ہنگاموں میں بڑا مزا آتا تھا۔ پلیٹ فارم پر ٹنگی ہوئی گھنٹیوں کی مقررہ ضربات، کبھی آپ کبھی ڈاؤن سگنل، انجنوں کی سیٹیاں، ریلوں کی گڑگڑاہٹ، مسافروں کی گہما گہمی، اور رات کو لال سبز روشنیوں کے جلوے، غرض اس پُر شور اور رنگ برنگی دُنیا سے اُسے بڑی دلچسپی تھی اور جب بھی موقع ملتا وہ پلیٹ فارم پر پہونچ کر جنکشن کی سرگرمیوں سے خوب لطف اُٹھاتا تھا۔ مسافر گاڑیاں اُسے اچھی معلوم ہوتیں۔ کالے سیاہ قومی ہیکل انجن کو وہ بہت غور سے دیکھتا

جو اپنے مقابلے میں ایک قلیل الجثہ آدمی کا تابع فرمان تھا اور جس کے ذرا سے اشارے پر اس عظیم وجسیم آہنی دیو کی پوری قوت حرکت میں آجاتی تھی، گویا وہ بے داموں کا غلام ہے۔ سرتابی یا تاخیر کی اس میں بالکل جرأت نہیں۔ ملک راج سوچتا بڑا ہو کر میں بھی ڈرائیور کیوں نہ بنوں؟ یہ نوکری کتنی اچھی ہے! پہاڑ کا پہاڑ اپنے قابو میں ہوگا۔ دوسروں کے لئے یہ کتنا ہی خونخوار اور منہ زور کیوں نہ ہو، ڈرائیور کے تو بالکل بس میں رہتا ہے۔ اس نے ذرا سی جنبش کی اور یہ زور سے چیخا۔ گویا اپنی دل ہلا دینے والی طاقت اور ڈرائیور کی اطاعت کا اعلان کر رہا ہے اور آناً فاناً چھک چھک کرتا ہوا یہ باتیں کرنے لگا۔ ڈرائیور کا عہدہ بھی تو بہت بڑا ہے! اتنی ساری گاڑیوں اور بے شمار انسانوں کو جو لئے چلا جاتا ہے مگر ایک بات اُسے بہت ناپسند تھی۔ ڈرائیور کے کپڑے ہمیشہ بے ڈھنگے اور میلے ہوتے ہیں اور اُن کے چہرے مہرے سے ہرگز یہ اندازہ نہیں ہوتا کہ اس کی محنت کا معاوضہ اُسے سات آٹھ سو روپے ماہوار ملتا ہے۔ اتنی بڑی تنخواہ کا خیال آتے ہی اُس کے دل میں کچھ خوشی سی ہونے لگتی جیسے سچ مچ اُس نے اپنے لئے ایک عمدہ نوکری ڈھونڈ لی ہے۔ بعد میں اُسے معلوم ہوا کہ میل ڈرائیور بننے کے لئے تو جوئے شیر لانی پڑتی ہے۔ سالہا سال تک ریلوے شیڈ میں بڑی طاقت اور محنت کا کام کیا جاتا ہے۔ مزید برآں ٹریننگ کے دوران میں شام کو کام کر کے فارغ ہوئے تو کپڑوں کے ساتھ ہاتھ منہ بھی کالک اور سیاہی میں بھر جاتے ہیں۔ کچھ عرصے بعد اس سے نجات ملی تو سفر اور انجن کی صعوبتیں رہی سہی کس بل نکال دیتی ہیں ـــــ اُس نے اپنے آپ پر ایک نظر ڈالی۔ اس کی نازک طبیعت اور پھول سا جسم یہ سب کچھ کیسے برداشت کر سکتا ہے؟ بھاری بھاری کل پرزے وہ کہاں اُٹھا سکے گا؟ کوئلے اور تیل کی کلونس میں اُس کا سرخ و سپید بدن بھی تو بدنما ہو جائے گا، اور یہ انجن کا ہیبت ناک پیٹ! ضرورت ہونے پر اس میں اترنے سے اُس کا دل نہ دہل جائے گا!! اور اس کی ہمت ٹوٹ گئی۔ اُس نے فیصلہ کر لیا کہ وہ ڈرائیور

ہرگز نہیں بنے گا۔

لیکن اُس کا دل ریلوں سے اُچاٹ نہیں ہوا۔ جنکشن کی بوقلموں دلفریبیاں اُسکے لئے اب بھی قائم تھیں۔ اسٹیشن سے اُسے ایک حد تک عشق ہو گیا تھا۔ اور اُسے گھڑی گھڑی ایسا معلوم ہوتا کہ کسی نے اُسے سُرخ سنگریزوں سے پٹے ہوتے پلیٹ فارم پر لا کھڑا کیا ہے اور یہ اصرار کہہ رہا ہے۔ "یہی تمہارا دائرۂ حیات ہے۔ یہیں تمہیں اپنے لئے جگہ بنانی ہوگی۔ تم ابھی سے اپنا کوئی ٹھکانا تلاش کر لو!" اور وہ اپنے دل میں کہتا۔ "یہ ٹھیک ہے، یہ ٹھیک ہے۔ ریلیں میری رگ رگ میں سما گئی ہیں، مجھے انہی کی نوکری کرنی ہے۔ تو کونسا عہدہ سوچ لوں؟"

پھر اس کی سطح ذہن میں ایک اور نقش ابھر آیا۔ وہ اینگلو انڈین گارڈ مائیکل! جو گرمیوں کی سفید اور سردیوں کی سیاہ وردی میں نہایت چست و چالاک اور خوبرو معلوم ہوتا ہے۔ اُس نے سوچا، گارڈ کا عہدہ بے شک عمدہ ہے۔ بائیں بغل میں لپٹی ہوئی لال جھنڈی، دائیں ہاتھ میں لہراتی ہوئی سبز جھنڈی، منہ میں چیل کی طرح چلچلانے والی سیٹی۔ اور سر پر شاندار سفید ہیٹ جس کے آگے سُرخ بانات پر گارڈ کا چمکدار نشان۔ یہ سراپا اُسے بہت اچھا معلوم ہوا۔ اور پھر گارڈ، ڈرائیور سے برتر بھی تو ہے۔ بغیر اس کی مرضی کے ڈرائیور ایک انچ نہیں ہل سکتا۔ گارڈ جب چاہے ریل چلائے، جہاں چاہے روک لے۔ اور اسے اپنے دل میں اطمینان ہو گیا۔ واقعی ڈرائیور تو مجبور ہے۔ پھر ایسی نوکری کون کرے؟ وہ تو گارڈ ہی بنے گا جو ساری ریل کا مالک ہوتا ہے۔ واقعی یہ عہدہ نہایت اہم ہے!

اور جب وہ زندگی کی ذمہ داریوں کو سمجھنے کے لائق ہو گیا تو اُسے ایک نئی بات معلوم ہوئی، وہ گارڈ تو بن ہی نہیں سکتا۔ کیونکہ جسٹس سانیال اس ملازمت کے خلاف ہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ ملک راج بھی اُن کی طرح جج بنے اور وہ لوگوں کو کہتے ہوتے

سُنیں "ملک راج لائق باپ کا لائق بیٹا ہے"۔ اس سے اُن کو کتنی خوشی ہوگی! کتنا افتخار محسوس ہوگا! ـــــ لیکن ملک راج کو قانون اور انصاف سے دلچسپی نہیں ہے۔ اس کی رائے میں یہ الفاظ بے معنی ہو گئے ہیں۔ ان کا مفہوم گم ہوگیا ہے۔ ان دائروں کے مرکز کسی نے مٹا دئے ہیں۔ اُس نے کچہری کی قانونی فضا میں حق و صداقت کو دم توڑتے دیکھا ہے۔ اُسے یاد ہے کہ ایک دفعہ ایک مظلوم عورت کے ساتھ اُس کا باپ بھی جو حد درجہ ایماندار منصف ہے، انصاف نہیں کر سکا۔ مخالف وکیل کی بحث اور اُن ثبوتوں کی موجودگی میں جو کسی نہ کسی طرح بہم پہونچا دئے گئے تھے، جسٹس سانیال بے بس رہ گئے۔ پھر بھی وہ اپنے بیٹے کو ریل کا بابو بننے کی اجازت نہیں دے سکتے۔ اس سے اُن کی شان کو بٹا جو لگے گا۔ اُن کے نام کی تحقیر جو ہوگی۔ ملک راج بھی تو بڑا ہو کر سانیال ہی کہلائے گا!

جسٹس سانیال کو ریل کی ملازمت خاص طور پر ناپسند ہے۔ کیونکہ انہوں نے جہاں تک مطالعہ اور تجربہ کیا ہے، ریلوے کا عملہ زیادہ تر کم پڑھے لکھے افراد پر مشتمل ہوتا ہے جن کے اخلاق اور کردار کا کوئی اعتبار نہیں۔ اسی لئے ریلوے والوں کو کوئی اچھی نظر سے نہیں دیکھتا، کوئی اُن کی عزّت نہیں کرتا۔ پھر وہ یہ کیسے گوارا کرلیں کہ اُن کا بیٹا جو آگرہ یونیورسٹی کا گریجویٹ بھی ہے، گارڈ بن جائے۔ یعنی بے حیثیت عہدیدار! لیکن وہ کیا کریں؟ آخر نئی روشنی کے باپ ہیں، جو یہ سکھاتی ہے کہ اولاد کی طبیعت کا رجحان نظر انداز نہیں کرنا چاہیئے۔ وہ مجبور ہو گئے ہیں اور سوائے ایک ٹھنڈا سانس بھر کر یہ کہنے کے کہ "کاش اس کا یہ میلان قانون کی طرف ہوتا" وہ اور کچھ نہیں کر سکتے۔

بالآخر اُنہوں نے ریلوے کے متعلق تمام معلومات حاصل کیں اور کئی ماہ کے تجسس کے بعد یہ تجویز کیا کہ ملک راج کو اے۔ ٹی۔ ایس (اسسٹنٹ ٹرافک سپرنٹنڈنٹ) بنوانے کی کوشش کرنی چاہیئے۔ اے۔ ٹی۔ ایس! ملک راج کے لئے اس رفیع و معزز عہدے کا

تصوّر بھی مشکل تھا۔ اُسے ایسا محسوس ہوا کہ کوئی بہت بڑی کرین اُسے بجری کی سڑک سے اُٹھا کر قطب مینار کی بلندی پر لے جا رہی ہے اور بیسیوں گارڈ، ٹکٹ کلکٹر، ٹی ٹی ای اسٹیشن ماسٹر، ٹرافک انسپکٹر اور نہ جانے کون کون گلیور کے بالشتیوں کی طرح اُسی بجری کی سڑک پر اُس کی جانب مُنہ اُٹھائے مؤدّب کھڑے ہیں۔ اور جب وہ قطب مینار کی بلندی سے نیچے اُتر آیا تو اُسے محسوس ہوا کہ وہ تو ڈر رہا ہے۔ جسٹس سانیال کی رائے اُسے کوئی خوفناک اقدام معلوم ہوئی۔ وہ مقابلے کا امتحان کیسے دے سکتا ہے؟ اُس میں اتنی اہلیت کہاں ہے؟ وہ اُن سے متفق نہیں ہے کہ وہ پبلک سروس کمیشن کا امتحان پاس کر سکتا ہے۔ اس کے احساسِ کمتری نے اُسے اس قدر عاجز جو بنا دیا ہے! جسٹس سانیال نے اُسے کئی بار سمجھایا کہ تم ایک دفعہ امتحان میں شریک ہو جاؤ، پاس ضرور ہو جاؤ گے، باقی میں سُلٹ لونگا۔ لیکن اُس کی اپنے اوپر بے اعتمادی نے اُسے امتحان میں شرکت پر آمادہ نہ ہونے دیا! اور وہ اپنی کم ہمتی کو چھپانے کے لئے یہی کہتا رہا کہ "یہ امتحان بیحد کٹھن ہے۔ ہندوستان بھر کے بہترین دماغ مقابلے میں شریک ہوتے ہیں اور بالفرض میں پاس ہو بھی گیا تو کچھ فائدہ نہ ہوگا۔ کیونکہ محض پاس ہونے سے تو کوئی اے۔ ٹی۔ ایس نہیں بن جاتا۔ اور آپ باقی کچھ نہیں سُلٹ سکتے!" اس کے تقرر کے لئے تو غیر معمولی کامیابی اور امتیاز چاہیئے"۔

جسٹس سانیال خاموش ہو گئے۔ اُنہیں یقین ہو گیا کہ ملک راج پست ہمت ہے۔ کسی اعلیٰ عہدے پر فائز ہونے کے لئے وہ خود کوئی جدوجہد نہیں کرنا چاہتا۔ آخر اُن کی سمجھ میں ایک اور تجویز آئی اور اُنہوں نے اسٹیٹ ریلویز کا خیال ترک کر کے کمپنی کی ریلوں کی طرف رجوع کیا، کہ اُن میں ملازمت حاصل کرنے کے لئے پبلک سروس کمیشن کا امتحان پاس نہیں کرنا پڑتا۔ یہاں تو اثر، سعی اور سفارش کارگر ہوتی ہیں۔ چنانچہ وہ دن رات بااثر اصحاب کی سفارشیں حاصل کرنے کی سعی میں لگے رہے۔

لیکن اُن کی اس عرصے کی دوڑ دھوپ اور پانی کی طرح روپیہ بہانے کا نتیجہ صرف یہ نکلا کہ اے، ٹی، ایس کے بجائے ملک راج کے متعلق اے، ایس، ایم (اسسٹنٹ اسٹیشن ماسٹر) کی آئندہ اسامی کے لئے غور کرنے کا وعدہ کیا گیا۔ جسٹس سانیال کو بڑی نا اُمیدی ہوئی۔ اُنکی کوششوں کی بس یہی قیمت ہے؟ وہ سوچنے لگے، میں نے اس کام کے لئے کتنے دور دراز مقاموں کا بار بار سفر کیا! ریلوے کے افسروں پر اثر ڈالنے کے لئے کن کن لوگوں کے احسانات لئے! ان افسروں کی خوشنودی کی خاطر کتنا کچھ خرچ کر ڈالا، اور اس قدر محنت، اس تمام تگ و دو کا پھل صرف یہ چھوٹی سی بے مایہ افسری! ـــــ مگر ملک راج کو اس سے قدرے طمانیت تھی کہ وہ اے، ٹی۔ ایس نہیں ہو سکا۔ کیونکہ اتنی بڑی افسری کی ذمہ داری کے لئے وہ ہرگز تیار نہیں تھا۔ ریلوں میں حادثات اور واردات ہوتی ہی رہتی ہیں۔ وہ اے، ٹی۔ ایس بن جاتا تو جانے کہاں کہاں حیران و پریشان بھاگنا پڑتا! اُسے تو اس کی بڑی خوشی تھی کہ وہ عنقریب اے، ایس، ایم بن جائے گا۔ اُس کا نام جو رجسٹرڈ کر لیا گیا ہے! بس آئندہ جو آسامی خالی ہو گی اُس پر اُسی کا تقرر ہو گا۔ اور یہ عہدہ ہے بھی سب سے اچھا۔ وہ بہت جلد اے، ایس، ایم سے ترقی کر کے ڈپٹی ایس۔ ایم اور پھر ایس۔ ایم بنجائیگا۔ یعنی تمام اسٹیشن پر اُسی کی بادشاہت ہو گی۔ گڈز کلرک، کوچنگ کلرک۔ یارڈ ماسٹر۔ بیج کلرک، بکنگ کلرک، نمبر ٹیکر، ٹکٹ کلکٹر، سب اُسکے محتاج رہیں گے۔

لیکن وہ "عنقریب" اے۔ ایس۔ ایم نہیں بنا۔ انتظار ہی انتظار میں کئی ماہ گذر گئے حتیٰ کہ ملک راج کی عمر پچیس سال ہونے کو آئی اور اس عرصے میں اس کی بجائے دوسرے کئی اُمیدوار اے۔ ایس۔ ایم مقرر ہو گئے۔ پھر ایک دن جسٹس سانیال کا انتقال ہو گیا اور چونکہ وہ شریف اور ایماندار آدمی تھے اس لئے اُن کے مرنے کے تھوڑے عرصے بعد اُن کے گھرانے پر مفلسی چھا گئی۔ بیوہ ماں اور چھوٹے بہن بھائیوں کا بوجھ ملک راج کے کندھوں پر آن پڑا ـــــ اور وہ ابھی تک اے۔ ایس۔ ایم نہیں بنا۔ آخر جب اُسے بالکل

مایوسی ہو گئی تو ایک روز خلافِ توقع اُس کے پاس انٹرویو کے لئے بلاوا آیا۔ اُس کے روئیں روئیں میں مسرّت ناچنے لگی۔ اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا اور وہ فوراً ملاقات کے لئے روانہ ہو گیا۔

جسٹس آنجہانی خود بڑے سرکاری عہدیدار تھے اور اُنہوں نے (ملک راج) سانیال کے لئے چند بڑے آدمیوں کی سفارش بھی پہونچا دی تھی اس لئے جب اُن سے بڑی سفارشوں والوں کی کھپت ہو گئی تو باقی اُمیدواروں کے ساتھ اُس کو بھی انٹرویو کیلئے بُلا لیا گیا، لیکن چونکہ دوسرے اُمیدوار اب پھر تازہ سفارشیں لائے تھے اس لئے اُن کو ترجیح دی گئی اور سانیال کی سفارشوں کے پیشِ نظر اُس سے کہا گیا کہ اب شاید سال بھر تک اے ایس، ایم کی جگہ نہ نکل سکے، اس لئے اگر چاہو تو تمہیں ٹکٹ کلکٹر مقرر کیا جا سکتا ہے۔ سانیال نے نا اُمیدی اور افسردگی کے ہوتے ہوئے اس کو غنیمت جانا کیونکہ سرکاری ملازمت کے لئے اُس کی عمر یوں بھی زیادہ ہو گئی تھی اور گھر کے اخراجات کے لئے آمدنی کا کوئی ذریعہ ہونا فوراً ضروری تھا۔ چنانچہ اُسے ایک چھوٹے سے اسٹیشن پر ٹکٹ کلکٹر بنا کر بھیج دیا گیا۔

باوجود قلیل تنخواہ کے اُس کو تسلّی تھی کہ وہ ریلوے کا ملازم ہے۔ وہ جہاں چاہے بغیر خرچ سیر و سفر کر سکتا ہے۔ رہی تنخواہ تو عام طور پر ایک گریجویٹ کو تیس چالیس سے زیادہ ملتے بھی کہاں ہیں؟ مزید برآں اس کا خیال تھا کہ چونکہ ریلوے میں کثرت معمولی پڑھے لکھے لوگوں کی ہے اس لئے وہ جلدی جلدی ترقی کر کے کسی اعلیٰ عہدے پر پہونچ جائیگا۔ سب سے بڑی بات تو اس محکمہ میں داخل ہو جانا ہے۔

اُسے ریل کی ملازمت کا اس قدر شوق تھا کہ اُس کے دماغ میں ہر روز ریلوے کی بہتری کے نئے نئے خیالات آتے تھے۔ وہ بزعمِ خود سمجھتا تھا کہ میں اپنی نئی نئی ترکیبوں

اور تجویزوں سے اس میں چار چاند لگادوں گا۔ میری وجہ سے اس محکمہ کی بہت شہرت ہوگی،
اور اپنی ان خوش فہمیوں کو اس نے پہلی بار کشن پور میں عملی جامہ پہنانا چاہا جہاں وہ اپنی ملازمت
کے تھوڑے دنوں بعد تعینات ہوا۔

کشن پور ایک چھوٹا سا گاؤں تھا جس کی آبادی ریلوے اسٹیشن سے تین چار میل دور تھی۔ آنے جانے والے مسافر سب دیہاتی تھے۔ غریب، سادہ لوح اور ہر کام میں بے قاعدہ۔ سواری گاڑیاں دن رات میں صرف تین آتی تھیں مگر جانے والے دیہاتیوں کا ہجوم اکثر بے وقت بھی ہوتا تھا۔ لہذا جب کوئی ٹرین اسٹیشن پر آتی تو ریل سے اترنے اور کشن پور سے جانے والے مسافروں کی روک تھام اور ان کے ٹکٹوں کا معائنہ بڑا مشکل ہو جاتا تھا۔ سانیال کی نئی نئی نوکری تھی اور تازہ تازہ جوش۔ وہ سوچنے لگا ان دیہاتیوں کی کسی طرح تربیت کرنی چاہیئے۔ انہیں گیٹ میں سے گذرنے کے آداب سکھانے چاہیئیں۔ چنانچہ ریل کے آنے سے پہلے جو لوگ دروازے کے اس طرف برآمدے میں جمع ہو جاتے تھے وہ ان کو ایک لائن میں کھڑا کر دیتا اور کہتا "باری باری آؤ اور اپنا ٹکٹ دکھاؤ"۔ لیکن جوں جوں ٹرین پلیٹ فارم کے نزدیک آتی، ان لوگوں کی بے چینی بڑھتی جاتی، حتیٰ کہ جب ریل سامنے آکر رکتی اور اس میں سے دیہاتی مسافر بھیڑ بکریوں کی طرح اترتے تو ان لوگوں کا پیمانۂ صبر لبریز ہو جاتا اور وہ ریل بابو کی ہدایت کو بھول کر ایکا ایکی گیٹ پر ٹوٹ پڑتے اور پوری بے قاعدگی اور بے ترتیبی سے فوراً اسٹیشن کے اندر گھس کر ریل میں سوار ہو جانے کے لئے کشمکش کرنے لگتے۔ سانیال انکو روکنے کی بہتیری کوشش کرتا مگر اس کی سعی، اس کی آواز کی طرح کہ "باری باری آؤ، اپنا ٹکٹ دکھاؤ" اس بے ترتیب انبوہ میں زائل ہو جاتی۔

آخر اس نے اس مشکل کا حل سوچ لیا اور کئی روز کی محنت کے بعد ایک بڑے سے تختے پر طرح طرح کے رنگوں سے موٹے موٹے حروف میں دو جملے لکھے کہ "باری

باری آؤ۔ اپنا ٹکٹ دکھاؤ"۔ اس کے چاروں طرف اُس نے نہایت خوشنما بیل بوٹے بنائے اور پھر اُسے گیٹ کے سامنے کی دیوار پر نمایاں جگہ آویزاں کر دیا۔ لیکن یہ دیکھکر اُسے بڑی تکلیف ہوئی کہ اُس کے ساتھیوں نے اُسے بالکل نہیں سراہا یا بلکہ ڈپٹی ایس ایم نے نقش و نگار کی تو تعریف کی مگر ان جملوں کے متعلق کہا "آپ نے ناحق اپنا وقت ضائع کیا۔ کیونکہ جن لوگوں کے لئے یہ عبارت لکھی گئی ہے وہ اس کو پڑھ ہی نہیں سکتے"۔ سانیال کچھ نا اُمید سا ہو گیا اور اُس کے دل میں خواہ مخواہ یہ بات بیٹھ گئی کہ چونکہ میں تعلیم اور خاندانی اعتبار سے ان سے بہتر ہوں اس لئے یہ لوگ مجھ سے جلتے ہیں۔ علاوہ ازیں ہر روز ایک ہی مقررہ کام یعنی گیٹ پر کھڑے ہو کر ٹکٹ جمع کرنے سے اُس کی طبیعت اُکتا گئی اور وہ کچھ ہمت سی ہارنے لگا۔

—— اور اس ایک سال کی ملازمت کے دوران میں اُسے نئے نئے تجربے ہوئے۔ اُس نے اب جانا کہ ریلوے ملازم کیوں عام طور پر اس اینگلو انڈین گارڈ مائیکل کی طرح چست و چالاک نہیں رہتے اور اُن کی وردیاں کیوں بے ڈھنگی ہوتی ہیں۔ شروع شروع میں وہ بھی اپنی وردی اور چال ڈھال کا بڑا خیال رکھتا تھا۔ لیکن حالات نے اُسے بتا دیا کہ جلدی جلدی ترقی کرنے کا کوئی امکان نہیں ہے اور اُسکی ڈگری سے اب اُسے کوئی امتیاز یا فائدہ نہیں پہونچ سکتا تو رفتہ رفتہ اس میں بددلی سی پیدا ہو گئی۔ ریلوے کے تحتی عملے کی بدحالی نے اس کا شوق ختم کر دیا، اور ریل کے دوسرے بابوؤں کی طرح اسکے ہیٹ کی سفیدی، سوٹ کی استری اور بوٹ کی پالش کا بھی اہتمام جاتا رہا۔ اس کی رفتار اور بات چیت میں بھی نمایاں تبدیلی ہو گئی؛ اور کم گوئی، ڈھیلے ڈھالے لباس اور لڑکھڑاتی ہوئی چال سے صاف معلوم ہوتا تھا کہ اس نوجوان کے دل میں اُمنگیں نہیں رہیں۔ اسے اپنی نوکری سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ یہ اس ملازمت کو صرف اس لئے کر رہا ہے کہ اس کے لئے مجبور ہے۔ اس کو زندگی کی گاڑی یوں ہی دھکیلنی پڑیگی۔ اسے کوئی دوسرا آسرا نہیں ہے۔

(۲)

لائن کلیئر ہوتے ہی اُس نے پھاٹک پر سے کُھنیاں ہٹالیں اور مُڑ کر اژدہام کو دیکھا۔ آج ۱۹۔ ڈاؤن پر خلافِ معمول زیادہ بھیڑ تھی، اور ریل میں جلدی سوار ہو جانے کا روایتی اضطراب لوگوں میں پھیلا ہوا تھا۔ لیکن اس سے زیادہ اُنکے چہروں اور آنکھوں سے وہ بیکسی اور وحشت ظاہر ہو رہی تھی جو مفلسی اور جہالت کی لازمی پیداوار ہیں۔ اُنکی اُداس اور بے بس نگاہوں کا سانیال پر بڑا گہرا ردِ عمل ہوا، اور ریل کے رُکتے رُکتے جب اُترنے اور ان جانیوالے مسافروں میں پُر شور تصادم ہونے لگا تو وہ جھنجلا اُٹھا۔ پھر بھی اُس نے ہر ممکن طریقہ سے اُن کو روکنے اور اُن کے ٹکٹوں کو جانچنے کی بڑی کوشش کی۔ وہ چیخ چیخ کر کہتا رہا "باری باری آؤ ــــ اپنا ٹکٹ دکھاؤ"۔ لیکن ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس وقت ان گاؤں والوں کو اس کا کوئی ڈر نہیں ہو۔ انہیں تو یہ اندیشہ ہو کہ جگہ بھر جائیگی یا ریل چھوٹ جائیگی۔ اور جب اُسے یہ محسوس ہوا کہ ان دیہاتیوں، ان جاہل حیوانوں کو بھی اس کی پروا نہیں ہو تو اُس کا صبر و قرار جاتا رہا اور طیش و غضب نے اُس پر دیوانگی طاری کر دی۔ معاً اُس نے کونے میں بھنچے ہوئے ایک دیہاتی کو دیکھا جو باوجود بڑھاپے کے جوانوں کی طرح آگے بڑھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اُس نے اُسکی گردن پکڑ لی اور ایکا ایکی ایک بے ہنگام چیخ کے ساتھ اس کو دھکا دیدیا۔ وہ بیچارہ اس غیر متوقع دھکے سے بھونچکا سا رہ گیا اور ابھی سمجھنے بھی نہ پایا تھا کہ یہ کیا ہو گیا کہ آن کی آن میں ٹکٹ بابو بھوکے شیر کی طرح اُس پر ٹوٹ پڑا۔ پھر تو گویا طغیانی سے بے قابو دریا کا بند ٹوٹ گیا اور سانیال کے مُنہ سے غریب اور جہلا کیلئے وہ تمام مغلظات نکلنے لگیں جو ایک عرصہ سے اُمراء اور اپنے سے بہتر لوگوں کیلئے اُسکے انجان ذہن میں جمع ہو رہی تھیں۔ گالیوں کے ساتھ ساتھ وہ اس غریب دیہاتی کو بُری طرح مارے بھی جا رہا تھا۔ جیسے وہ اپنی تمام مایوسیوں اور ناکامیوں کا غصہ ان بیچارے دیہاتیوں کی بے ترتیبی اور بے قاعدگی کے بہانے اس ایک کمزور ہستی پر اُتارنا چاہتا ہے۔

لوگ سہم کر پرے کھڑے ہو گئے تھے اور وہ بوڑھا اپنے لبیری دہقانی کپڑوں میں لپٹا ہوا بغیر کسی مدافعت کے پٹے جا رہا تھا۔ بس رُک رُک کر اُس کے مُنہ سے یہ بات نکل رہی تھی۔

"بابوجی .... مجھے جانے دو .... ریل چُھٹ جائے گی" اُس کا لٹھ اور زادِ راہ ایک طرف لڑھک گیا تھا اور اس کی معصوم نگاہیں چوٹ اور گالیوں کے باوجود اُس بے رحم سے التجا کئے جا رہی تھیں "بابا... مجھے چھوڑ دو ــــ میری ریل ــــ"

ــــ اور دفعتاً ایک بارعب اور بلند آواز سُنکر سانیال اپنے آپے میں آ گیا اور اُسکی دیوانگی فرو ہو گئی۔ کوئی انتہائی تعجب اور غصّہ میں کہہ رہا تھا "یہی وہ وحشی ہے جس کی ہم نے آج ٹی ٹی ای بنانے کی سفارش کی تھی؟ جنگلی کہیں کا ــــ!!"

سانیال نے خالی الذہن ہو کر اس مجرم کی طرح، جسے یکایک اپنے سنگین جرم کا احساس ہو جائے گھبرائی ہوئی نظروں سے دیکھا کہ اس کا ہم عمر اے۔ ٹی۔ ایس: اسٹیشن ماسٹر سے کچھ اور کہتا ہوا اپنے سیلون میں چڑھ رہا ہے۔

ٹکٹ بابو کو سنبھلتا دیکھ کر مسافروں کی ذرا ہمت بندھی اور وہ پھر چوروں کی طرح دبے پاؤں گیٹ کی جانب بڑھنے لگے۔ مظلوم صورت سانیال ساکت و جامد کھڑا تھا۔ اُسکے ہوش و حواس گم ہو گئے تھے، بس اُس کے مُنہ سے وہی الفاظ اس طرح ہولے ہولے ادا ہو رہے تھے جیسے کسی بیجان مشین میں سے آواز آ رہی ہو "باری باری آؤ ــــ اپنا ٹکٹ دکھاؤ"

ــــ اور سامنے آسمان کے شفق زاروں سے دھنک آہستہ آہستہ رخصت ہو رہی تھی۔

(۱۹۴۲ء)
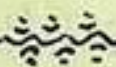
شبنم کے سبزہ زاروں میں

یہ جزیرہ شبنم کی کہانی ہے۔
شمالی ہند کا وہ سیاحت پسند باشندہ الیگزنڈر اڈوک پر آکر کھڑا ہو گیا اور اس نے اپنے سامنے موجیں مارتے ہوئے ناپید اکنار سمندر کو نگاہ غلط انداز سے دیکھا۔ بمبئی کے گردونواح میں ہر چند میل کے فاصلہ پر دور دور تک جزیرے پھیلے ہوئے تھے اور سہ پہر کے ڈھلتے اجالے میں ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ان کے چپے چپے پر خوابناکی سی طاری ہو رہی ہے۔ اس نے ان کو ایک ایک کر کے گنا اور سوچنے لگا کہ اتوار اور دوسری چھٹیوں میں میں نے ان میں سے اکثر جزیروں کی سیر کر لی ہے۔ اب صرف چند ساحلی علاقے رہ گئے ہیں اور میں کرسمس کی چھٹیوں میں ان سب کی بھی سیاحت کر لوں گا۔ باقی ماندہ جزیروں کا انتخاب کرتے ہوئے اسے خیال آیا کہ جزیرہ اورن کے اختتام پر جو ایک نرمل البیلی جھیل رواں دواں ہے اس کے پرلے کنارے پر ایک کم معروف مقام بھی تو ہے جس کا ذکر اس کے پارسی دوست نے اس سے شعروں کے الفاظ میں کیا تھا۔ اور جب اسے وہ تفصیلات یاد آئیں جو اس آتش پرست نے ایک داستان گو کی طرز میں بیان کی تھیں تو اس کی پُرشوق طبیعت نے فیصلہ کر لیا کہ وہ اس دفعہ سب سے پہلے اسی گُل پوش وادی میں جائے گا جو کسی ایشیائی شاعر کے نازک تصورات کی طرح

حسین و جمیل ہے، جو حُسن و شباب کا گہوارہ اور زندگی کی بوقلمونیوں کا نگار خانہ ہے۔ اور جسے لوگ جزیرۂ شبنم کہتے ہیں۔

——— اور جب اُس نے جھیل پار کر لی تو آفتاب غروب ہو رہا تھا اور اسکی لالہ گوں کرنیں گوشۂ مغرب کو حنائی طرح رچا رہی تھیں۔ درختوں کی ہری بھری ٹہنیوں پر بلبلِ ہزار داستان اور دوسرے خوش گلو پرند نغمہ سرائی میں محو تھے اور معطر و سبک رو ہوائیں ادائے دلربائی سے چل رہی تھیں۔ کشتی بان نے اسے بتایا تھا کہ سامنے، جو ہڑ کے پہلو میں جو پگڈنڈی ہے وہ بل کھاتی نہروں اور اونچے نیچے کھیتوں کو بچتی بچاتی سرائے کو چلی جاتی ہے اور چونکہ یہاں غیر ملکی مسافر کبھی کبھار آتے ہیں اسلئے ان لوگوں کے ٹھہرنے کا انتظام سوائے اس جگہ کے اور کہیں نہیں ہے۔ لیکن شفق زار مغرب اور اُس کے رنگین و دل نشیں نظارے سے متاثر ہو کر اس کا شاعرانہ ذہن یہ ضروری بات بھول گیا اور وہ اپنا سوٹ کیس اُٹھا کر، جس میں اس کا مختصر سا سامان تھا پگڈنڈی کی مخالف سمت میں، اُن پہاڑی ڈھلانوں کی طرف چل پڑا جن کی چوٹیوں کے پیچھے سورج کی سیمیں اور زرّیں کرنیں گلابی اور شفتالو رنگوں سے کھیلتی ہوئی گم ہوتی جا رہی تھیں۔

چلتے چلتے وہ ایک لمبوتری چٹان کے دامن میں پہونچا۔ لیکن پیشتر اس سے کہ وہ دائیں یا بائیں جانب مُڑتا ایکا ایکی اُس نے دیکھا کہ چٹان کے بالائی سرے پر ایک نیم برہنہ لڑکی کہیں سے نمودار ہوئی اور غوطہ زنی کے انداز میں نیچے چھلانگ مار کر غائب ہو گئی ہے۔ وہ متحیر رہ گیا اور نہایت سرعت سے اس پتھریلے مقام کی جانب لپکا جہاں اُس نے یہ حیرت کار منظر دیکھا تھا۔ اس چٹان کے قدموں میں ایک صاف و شفاف جوئبار خراماں خراماں بہی جا رہی تھی ——— اور اس کا منبع وہ ہوسلے ہو لے گرنے والا آبشار تھا جو شمال مشرقی پہاڑوں سے دودھ جیسے جھاگ اور برف جیسی پھوار

ساتھ لاتا تھا۔ اُس نے پُراشتیاق نظروں سے نہر کو دُور دُور تک بغور دیکھا لیکن جب وہ لڑکی اُسے کہیں تیرتی ہوئی نظر نہیں آئی تو وہ ششدر و حیران کچھ دیر اپنے ماحول کا مطالعہ کرنے لگا۔ نہر کے کنارے کنارے ناریل اور تاڑ کے اُونچے اُونچے ٹیڑھے سیدھے درخت تاحدِ نظر چلے گئے تھے، اور ان کے اطراف و اکناف میں مکمل خاموشی پھیلتی جا رہی تھی۔ مزید برآں ابتدائے شب کے ہلکے ہلکے دھندلکے، شفاف آب رواں کی مترنم موسیقی، اور ان پھولوں کی مستانہ وار خوشبو نے جو صرف غروب آفتاب کے بعد مہکتے ہیں اس خاموشی کو اور بھی پُراسرار بنا دیا تھا۔ پھر یکایک اُس نے آبشار اور نہر کے سنگم پر دیکھا کہ کنول کے چوڑے پتّوں کے درمیان ایک انسانی ــــ بلکہ نسوانی ــــ چہرہ اُسے حیرت سے تک رہا ہے۔ اور آپ ہی آپ اُسے وہم سا ہونے لگا کہ یہاں کوئی طلسم تو نہیں ہے؟ کیا خبر یہ سامنے کوئی جل پری ہو جو اپنا روایتی جادو کر کے مجھے اپنی طرف کھینچ لینا چاہتی ہو۔

آخر اپنا خوف مٹانے کے لئے اس نے ذرا توقف کے بعد، ہمت کر کے آواز دی: "کیا تم میری بات سمجھتی ہو؟"

اس کا سوال چٹانوں اور پہاڑیوں سے ٹکرا کر، جن سے نہر ایک کوزے کی مانند گھری ہوئی تھی، جب صدائے بازگشت کی طرح خاموش ہو گیا تو جل ترنگ کی سُریلی تان کی مانند صاف اور شیریں آواز آئی: "ہاں! مگر تم کون ہو؟"

"مسافر!" اُس نے بنت البحر پر نگاہیں جماتے ہوئے کہا۔

کنول کے پتے ہلنے لگے۔ اور وہ مسکراتے ہوئے بولی: "تو مسافر! ــــ تم یہاں کیوں آئے ہو؟ اپنی راہ کیوں نہیں چلتے؟"

مُسافر پر اُسکے محیر کن لب و لہجے اور لطیف و شیریں آواز کا بڑا اثر ہوا اور اُسکے مُنہ سے بےساختہ نکلا: "میں تھک گیا ہوں، مجھے سرائے کا راستہ بتا دو۔"

جواب میں پھر ایک دلنواز قہقہے کی آواز سنائی دی جیسے کسی مغل شہزادے کے شبستانِ عیش میں سنہری گھنٹیاں بج رہی ہوں۔ اور وہ نیم برہنہ لڑکی کبھی غوطہ لگاتی، کبھی سطحِ آب پر اُبھرتی آہستہ آہستہ نہر سے نکل آئی۔

پھر اُس نے پکارا: "مسافر! تمہارے پیچھے یاسمن کے پھولوں کا جو تختہ ہے اس پر سے میرا لباس اُٹھا کر میرے پاس پھینک دو۔"

مُسافر نے اُسکے بھیگے ہوئے، نیم عُریاں بدن کو عجیب نظروں سے دیکھا اور اس حسینۂ آب کا پھول جیسا خوبصورت اور نازک جسم اُسکے دل میں کھب گیا۔

۔۔ اور جب اُس کو اپنے کپڑے مل گئے تو اُس نے اشارہ کرتے ہوئے نرم آواز میں کہا: "مسافر! ۔۔ تم نیچے آجاؤ میں تمہیں سرائے تک پہونچا دوں گی۔"

مُسافر نیچے اُتر آیا تو اس سراپا حُسن و جمال کے قرب اور اس کی معصوم بیباکی سے اس کے دل و دماغ میں عجیب عجیب سے احساسات پیدا ہونے لگے۔ شاید وہی احساسات جو سومرسٹ موہام کے تخیل نے الھڑ انجلی کو تالاب کے کنارے دیکھکر لوٹن کے دل میں پیدا کر دئے تھے۔ مسافر کی ایک ہی نگاہ نے اُسے بتا دیا کہ اس دوشیزہ کی جلد اور رنگ میں اُجلے پن اور خُون کی دمک کا ایک ایسا حسین امتزاج موجود ہے جو کسی شب بھر کی جاگی ہوئی پہلی رات، کی دُلہن۔ کے بوں پر لاکھے کی سیاہی مائل سُرخی سے پیدا ہو جاتا ہے۔ ہر چند کہ اس کی عمر سولہ سترہ سال کی تھی اور جوانی کی سرمستیاں اسکے ایک ایک عضو سے اس طرح ظاہر ہو رہی تھیں جیسے چشمۂ انوار سے کرنیں پھوٹیں لیکن اُس کی منور پیشانی اور عارض گلگوں پر ابھی تک وہ شوخیاں اور بھول پن برس رہا تھا جو عہدِ طفلی کا طرۂ امتیاز ہیں۔ علاوہ ازیں مقامی لباس میں اس کی بھری بھری پنڈلیاں اور سڈول باہیں کھلی دیکھ کر وہ دم بخود اور چُپ چاپ اُسے ٹکٹکی باندھے دیکھے گیا۔

دوشیزہ مسافر کو اس طرح مبہوت اور کھویا کھویا دیکھ کر مُسکرائی اور سکوت کو توڑتے

ہوئے کہنے لگی۔" مسافر! شاید تم اس جزیرے میں پہلی دفعہ آئے ہو؟"

مسافر گویا کسی خواب سے چونک کر بولا" ہاں!"

دوشیزہ نے روانہ ہوتے ہوتے پھر کہا" مسافر! تم ہمارے جزیرے میں کیوں آئے ہو؟ کیا تم بھی ان تاجروں کی طرح ہو جو ہمارے وطن کی قدرتی دولت کو سمیٹ کر لے جاتے ہیں؟"

مسافر اس سادگی پر فدا ہو گیا اور چلتے چلتے بولا" نہیں میں تاجر نہیں ہوں۔ میں تو تمہارے اس خوبصورت جزیرے کی صرف سیاحت کرنے آیا ہوں! ــــ کیا تم مجھے یہاں کی سیر کرا دوگی؟"

دوشیزہ نے اپنی بڑی بڑی نرگسی آنکھوں سے اسے دیکھا اور جواباً بولی" تم بڑے عجیب آدمی معلوم ہوتے ہو مسافر! جو اس دُور دراز اور گمنام مقام کی سیر کرنے کیلئے آئے ہو، ورنہ عام طور پر تو لوگ ہمارے پھول، پھل اور اناج لیجانے کیلئے آتے ہیں۔ شاید تم اچھے آدمی ہو۔ میں تمہیں یہاں کی سیر کرا دوں گی"

جب وہ مولسری کے مہکتے ہوئے درخت کے نیچے سے گذرے تو مسافر نے پوچھا" تمہارا نام کیا ہے؟"

اُسکے لبوں پر اسکی مخصوص مسکراہٹ کھِل گئی، اور وہ دلربائی کے لہجہ میں بولی۔

" میرا نام گلاب رو ہے ــــ اب تم بھی اپنا نام بتا دو"

مسافر ذرا کی ذرا ٹھٹکا۔ مختلف غزلوں کے کہیں کہیں سے کچھ پورے اور کچھ نامکمل اشعار اُسے یاد آ رہے تھے ــــ گلاب رو کا جواب سُن کر وہ اُن کو مطلق بھول گیا اور جواباً کہنے لگا" تم نے مجھے کئی بار مسافر کہا ہے۔ یہ مجھے تمہاری زبان سے بڑا پیارا معلوم ہوتا ہو۔ تم مجھے مسافر ہی کہا کرو ــــ اور دیکھو" اُس نے اُس کے سامنے آکر کہا" بیشک تم پھول کی مانند ہو، اور سبزہ و گل کے اس بے پناہ جزیرے میں مجھے تم ہی سب سے

اچھی، سب سے خوبصورت اور سب سے زیادہ نازک معلوم ہوتی ہو۔ میرا جی چاہتا ہے میں تمہیں گلِ شبنم کہوں!"

اور گلِ شبنم ایک دم سے باندازِ رقص گھوم گئی اور مسافر کو اپنی شریر اور چمکدار آنکھوں سے گھورتی ہوئی بولی۔ "شاید تم شاعر ہو!"

(۲)

اسے یہ جان کر بڑی خوشی ہوئی کہ گلِ شبنم سرائے کے مالک کی بیٹی ہے جو بوڑھا اور بدمزاج شخص ہے۔ خود سرائے بھی صحیح معنی میں سرائے نہیں تھی بلکہ اس بوڑھے نے اپنے ہی نیم پختہ مکان کا ایک حصہ اس غرض کے لئے وقف کر رکھا تھا۔ کھانے پینے کا بھی وہاں کوئی انتظام نہیں تھا بلکہ گھر کے وسیع کنبے کے لئے جو کھانا پکتا تھا اسی میں کچھ رد و بدل کر کے مسافروں کے آگے رکھ دیا جاتا تھا۔ اور جب مسافر اس سرائے میں آیا تو حسبِ معمول وہ اکیلا مہمان تھا، پھر بھی سرائے کا مالک جب اُسے ٹھہرا کر چلا گیا تو بہت دیر تک کسی نے اس کی خیر خبر نہیں لی۔ چنانچہ جب اس کو بھوک نے زیادہ ستایا تو اس نے آوازیں دینی شروع کیں، جن کے جواب میں صرف اتنا سنائی دیا کہ وہ کبھی گھر والوں پر ناراض ہوتا ہے کہ کیوں کوئی مسافر کے پاس نہیں ہو آتا اور کبھی مسافر کو بُرا بھلا کہنے لگتا کہ یہ کیوں غل مچائے چلا جاتا ہے؟ آخر کوئی گھنٹہ بھر گذرنے کے بعد وہی نازک بدن محبوبانہ انداز میں اندر داخل ہوئی۔ اس کے ایک ہاتھ میں طشت تھا جس میں وہ اس کے لئے تلی ہوئی مچھلی اُبلے ہوئے چاول اور تازہ دودھ لائی تھی۔ مسافر چارپائی پر اپنا سُرخ فرانسیسی فلش کا کمبل تہ کر کے رکھ رہا تھا، اسے دیکھ کر جلدی سے بولا "مجھے بہت زور کی بھوک لگ رہی ہے لیکن میں نے ابھی تک غسل نہیں کیا۔ یہاں نہانے کا کیا انتظام ہے؟"

گلِ شبنم اس کے سفید بستر، خوبصورت تکیئے اور رنگین کمبل کی دل ہی دل میں

تعریف کر رہی تھی۔ اس کا سوال سُن کر وہ استعجاب سے بولی: "نہانے کا بھی کوئی انتظام ہوتا ہے۔ یہ جھیل اور یہ نہریں کس لئے ہیں؟"

مسافر نے سچ مچ دلچسپی لیتے ہوئے کہا: "مجھے تیرنا نہیں آتا۔ ہم لوگ تو گھر پر ہی نہاتے ہیں۔ کیا یہاں عورتیں بھی باہر نہاتی ہیں؟"

"اور کیا!" گل شبنم نے اس کا سرتاپا جائزہ لیتے ہوئے جواب دیا: "میں تو ہمیشہ سرِ شام اسی آبشار کی پھوار میں غسل کرتی ہوں۔ تنہائی اور آزادی سے نہانے میں بڑا لطف آتا ہے، اچھا میں تمہیں ایک گھڑا لا دوں گی۔"

اور جب وہ پانی لے آئی تو واپس جاتے ہوئے کہنے لگی: "میں اب کل علی الصبح آؤں گی اور تمہیں اپنے ساتھ سیر کرانے لے چلوں گی۔"

"ذرا ٹھیرو!" مسافر نے اسے روکتے ہوئے کہا: "ایسی کیا جلدی ہے؟"

گل شبنم دوشِ نسیم پر اٹھلاتے ہوئے کنول کی طرح جھوم کر بولی: "دیکھو آج چودھویں رات ہے اور اس رات کو ہم "جشنِ ماہ" مناتے ہیں۔ یہ سامنے انار اور فالسے کے درختوں کی درختوں کی قطار کے پیچھے جو چمن ہے، اس میں میری سہیلیاں میرا انتظار کر رہی ہونگی۔ میں اب جاتی ہوں۔"

"تو مجھے بھی اپنے ساتھ لے چلو۔ غسل اور کھانا کھانے میں مجھے زیادہ دیر نہیں لگیگی۔" وہ قمیص اُتارتے ہوئے بولا۔

"نہیں مسافر!" گل شبنم اس کے طاقتور بازوؤں میں مچھلیاں مچلتی ہوئی دیکھ کر بولی: "وہاں تو صرف کنواری لڑکیاں جمع ہوتی ہیں اور آدھی رات تک چقماق اور پھولوں کے کھیل کھیلتی رہتی ہیں۔ تم وہاں ہرگز نہ جانا ورنہ بدنام ہو جاؤ گے۔ البتہ اگر تمہیں نیند نہ آئے تو اس کھڑکی کے عقب میں جو گلزار ہے وہاں چہل قدمی کر لینا۔ چاندنی میں نہائی ہوئی کائنات بڑی بھلی معلوم ہوتی ہے۔" — اور اس سے پہلے کہ وہ کچھ اور

کہتا گُل شبنم خواب کی پرچھائیں کی مانند غائب ہو گئی۔

دوسرے روز صبح جب مشرقی چراگاہوں میں زمین و آسمان سونا اُگل رہے تھے، وہ اُسے اپنے ساتھ لیکر سیر کو نکلی۔ قدم قدم پر فردوس نظر درخت، بیلیں اور پودے لہلہا رہے تھے۔ مختلف النوع پھلوں کی تروتازگی اور رنگ برنگی شگوفوں کی رعنائی دعوتِ نگاہ دے رہی تھی۔ لچک دار شاخوں پر ننھے ننھے رنگین پرندا اپنی پُرکیف موسیقی سے باغوں اور جنگلوں کی رونق بڑھا رہے تھے۔ دُور دُور تک گھاس کی سبز اور دھانی پتیوں پر شبنم یوں چمک رہی تھی جیسے موتیوں کے دانے شعاعِ آفتابی میں جھلل جھلل کر رہے ہوں۔ اور نسیم سحری آبشاری نہروں کی لطافت اور گلستانوں کی عطر بیز تاثیر اپنی جلو میں لیئے اٹکھیلیاں کرتی پھر رہی تھی۔ جب وہ کھیتوں میں سے ہو کر گذرے تو مسافر نے دیکھا کہ جزیرۂ شبنم کی پیداوار میں بے انتہا فراوانی ہے۔ اناج کی لانبی لانبی بالیں سر بلند کیئے آپس میں سرگوشیاں کرتی ہوئی معلوم ہوتی تھیں اور ترکاریوں کے پتّوں اور بالائی گلوں میں ہوا اس طرح سرسرا رہی تھی جس طرح صدہا رنگوں کے سمندر میں بے شمار لہریں اُٹھ رہی ہوں۔ جابجا ان کو کسان اور دوسرے سادہ لوح لوگ ملتے جو مسافر کو اجنبی شکاری کپڑوں میں استعجاب سے اور گلاب رُو کو پُرخلوص محبت سے دیکھتے۔ وہ اُنہیں دیکھ کر مسکراتی اور دو ایک جملے اُن کے گھر والوں کے متعلق کہتی، اور وہ لوگ اس کا جواب نہایت خوش روئی اور متشکرانہ دیتے۔ راستہ میں مختلف عمروں اور طبقے کی عورتیں بھی ملتیں اور وہ گلاب رو سے بڑے تپاک سے پیش آتیں۔

اور ان باتوں سے مسافر نے یہ رائے قائم کی کہ یہ ہنس مکھ لڑکی سب کی محبوب و مقبول ہے، اور جس پیار سے گُل شبنم اس ماحول اور ان لوگوں کا ذکر کرتی تھی اس سے اُس کو اندازہ لگایا کہ اس زمین کا ذرہ ذرہ اُسے بے حد عزیز ہے۔ لیکن یہاں کے لوگوں کے

متعلق اسے ایک عجیب سی بات معلوم ہوئی۔ وہ یہ کہ یہاں کی عورتیں زیادہ تر پھرتیلی اور چست وچالاک ہیں اور مرد زیادہ تر آرام طلب اور سست ہیں جیسے ٹینی سن کی خیالی مخلوق کنول خور (Lotus Eaters) ہوں۔

سارا دن گل شبنم کے پہلو بہ پہلو اس جہانِ رنگ و بو کی سیر کرتا رہا، اور خود گل شبنم پر مسافر کی ہمراہی ایک عالمِ کیف و سرور طاری کرتی رہی۔

دن چھپنے کے قریب جب وہ سرائے واپس لوٹے تو مسافر نے ایک بالکل غیر متوقع منظر دیکھا۔ سرائے کا مالک اپنے بیرونی احاطے میں بیٹھا اپنے بڑے داماد پر بہت بری طرح خفا ہو رہا تھا، اور اس کی پُر غضب باتوں سے ظاہر ہوتا تھا کہ غصّہ کی وجہ داماد کی محدود آمدنی ہے جس پر سارے خاندان کا دار و مدار ہے۔ وہ بے چارہ جب اپنی ذلّت وخواری کو زیادہ برداشت نہ کر سکا تو دبی زبان سے بولا" آخر میں اتنے بڑے کنبے کی کیسے کفالت کر سکتا ہوں؟ تمہارے اتنے سارے بچّے، تمہاری بیٹیوں اور بیٹوں کے بچّے سب میری جان پر کیوں عذاب بنے ہوئے ہیں؟ تمہارے جوان جوان لڑکے ہر وقت تاڑی کے نشے میں چور رہتے ہیں۔ تم ان کو کبھی کام کرنے کے لئے نہیں کہتے؟"

سرائے کا مالک آپے سے باہر ہو گیا اور گالیاں دیتے ہوئے بولا" اگر ہم سب تمہاری جان کے لئے عذاب ہیں تو تم یہاں سے نکل جاؤ۔ اور اپنی منحوس شکل میری بیٹی کو مت دکھانا!"

اور منحوس شکل داماد کھسیانہ ہو گیا۔ اور معاملہ رفع دفع کرنے کے لئے اپنے خسر کے پاؤں دباتے ہوئے عاجزی سے بولا" بابا! تم خفا نہ ہو کل سے میں اور زیادہ محنت کیا کروں گا"

پھر مسافر نے دیکھا کہ صحن میں کئی کالے کلوٹے اور ننگے دھڑنگے بچّے، روتے بسورتے کیڑوں مکوڑوں کی طرح رینگ رہے ہیں اور ان کے غلیظ جسم پر مکھیاں بھنک

رہی ہیں مگر کوئی اُن کی پروا نہیں کرتا۔ گھر کی عورتیں اور لڑکے لڑکیاں خسر اور داماد کی لڑائی کا تماشہ دیکھ رہی ہیں۔

مسافر کو بڑی مایوسی ہوئی۔ اُسے سان و گمان بھی نہ تھا کہ اس دلکش اور دلفریب تصویر کا ایسا گھناؤنا رُخ بھی ہو سکتا ہے۔ اس نے سوچا اس جزیرے میں صرف زمزمے اور خندہائے جمیل ہی نہیں، گریہ اور نالے بھی ہیں۔ اور وہ مایوس و متحیر جلدی سے اپنے کمرے میں چلا گیا۔

شام کا کھانا کوئی اور لیکر آیا تو اس کو زیادہ حیرت نہیں ہوئی۔ وہ سمجھا کہ شاید میں نے سرائے کے باہر جو کریہہ منظر دیکھا ہے اس سے وہ محجوب و نادم ہو گئی ہے حالانکہ وہ اپنی عادت کے مطابق شام کا غسل کرنے جھرنے پر چلی گئی تھی — البتہ جب وہ رات شروع ہونے کے کافی دیر بعد اُس کے پاس آئی تو مسافر اس اُلجھن میں مبتلا تھا کہ چونکہ اس جزیرے کی سیاحت ختم ہو چکی ہے اس لئے اُسے کل صبح روانہ ہو جانا چاہیئے لیکن گل شبنم کی خاطر اسکی طبیعت یہاں سے جانے کو نہیں چاہتی تھی۔

"تم نے کھانا کھالیا؟" گل شبنم مسکراتی اور سنبل کی طرح لہراتی ہوئی بولی، "تاڑی پیو گے؟"

"نہیں، میں تاڑی نہیں پیا کرتا۔" مسافر نے اُس کے شنگرفی اور نیلمیں لباس کے پس منظر میں اُسے ایک یونانی مجسمہ حسن کی مانند ابھرتے ہوئے دیکھ کر کہا۔ "گل شبنم! میں کل صبح واپس چلا جاؤں گا۔"

گل شبنم بجھی ہوئی قندیل کی طرح افسردہ ہو گئی اور پھر آہستہ سے کہنے لگی "کیا ایک دو روز اور نہیں ٹھہر سکتے مسافر؟ مجھے تمہاری باتیں بڑی اچھی معلوم ہوتی ہیں!"

مسافر فانوس بلوریں کی مانند جگمگا اٹھا۔ "گل شبنم! تم چاہتی ہو تو میں ابھی چار روز اور

ٹھہر سکتا ہوں، اس جزیرے کی ہر شے نے میرا دل موہ لیا ہے۔"

چنانچہ روزانہ وہ دونوں اکٹھے گلستانوں اور مرغزاروں کی سیر کرنے نکلتے تھے اور منچلا کیوپڈ دیکھ رہا تھا کہ ان دونوں کے قلزمِ عشق میں موجیں اُٹھنے لگی ہیں۔ انجام کار چھٹیوں کے آخری دن جب وہ شام کی سیر سے واپس آرہے تھے اور گل شبنم اپنے جزیرے کی فسوں کاری اور سحر کاری پر اختتامی تبصرہ کر رہی تھی، تو اُس نے یکایک پوچھا۔ "اور آپکی بمبئی بھی تو نہایت خوبصورت ہے! ہمارے کنوینٹ میں جہاں میں جونیر کیمبرج میں پڑھتی تھی، ایک بوڑھی اُستانی ہیں، وہ کہتی تھیں کہ بمبئی کی عالی شان عمارتوں اور نورانی جگمگاہٹوں کے مقابلے میں یہ جزیرہ بالکل گاؤں معلوم ہوتا ہے۔ وہ یہ بھی کہتی تھیں کہ وہاں چھوٹی چھوٹی ندیاں نہیں بہتیں بلکہ بہت بڑا سمندر ہے جس کے کنارے ہندوستان کے سب سے بڑے ہوٹل ہیں اور اُن میں ایسا عمدہ ناچ رنگ ہوتا ہے کہ بس دیکھے جاؤ۔ انہوں نے یہ بھی کہا تھا کہ بمبئی شہروں کی دُلہن ہے اور ـــــ"

مسافر کی آنکھوں میں یکبارگی چمک پیدا ہو گئی، اور اُس نے اُس کے دونوں طرف اس طرح ہاتھ پھیلاتے ہوئے کہا کہ اُس کے جسم سے مس نہیں ہوئے "تو تم میرے ساتھ بمبئی چلو۔ بمبئی واقعی عروس البلاد ہے۔ تمہارا یہ جزیرہ بھی حسین ہے مگر بمبئی حسین ہونے کے علاوہ متمدن بھی ہے۔ وہ ایک عجیب و غریب دُنیا ہے جس کے پُر شکوہ اور انوکھے نظاروں کا کوئی بغیر دیکھے تصوّر نہیں کر سکتا۔"

شوق اور اچنبھے سے گل شبنم کے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی اور اس دفعہ جواباً اسکے لبوں پر مسکراہٹ نہیں آئی۔ اس کی بجائے اُس کی آنکھوں میں حجاب جھلک آیا اور وہ نظریں نیچی کرتے ہوئے بولی "مسافر! ہمارے یہاں کنواری لڑکیاں جھیل پار نہیں کرتیں۔"

مسافر نے والہانہ اس کی شہابی اُنگلیاں اپنے ہاتھ میں لے لیں اور یہ پہلا موقع

تھا کہ اُس نے اس گلبدن کو چھوا۔ "گل شبنم!" اُس نے سرگوشی کے اس لہجہ میں کہا جو ہر مرد عمر میں ایک بار ہی کسی دوشیزہ کے حسن شرربار سے مفتوح ہو کر اختیار کرتا ہے۔ "میری طرف دیکھو، میرے قلب کا ریشہ ریشہ تمہارے لئے بیقرار ہے، تم میری وفا پر اعتماد کرو، میں تم سے ہمیشہ محبت کروں گا، میرے ساتھ شادی کر لو، تم ہمیشہ خوش رہو گی، بمبئی کے ایک ایک حصّہ کی بھی میں تمہیں سیر کراؤنگا۔"

(۳)

کھلی فضا اور بنگلے نما مکان کی رہنے والی جب تیسری منزل کے ایک عقبی فلیٹ میں داخل ہوئی جو اگرچہ بمبئی کی ضرب المثل گنجائش کی کمی کے لحاظ سے نہایت کشادہ اور راحت رساں تھی لیکن درحقیقت تنگ و محدود، تو اُسے بڑا تعجب ہوا مگر رفتہ رفتہ اس مکان اور اسکے تکلفات کو اُسے قبول کرنا ہی پڑا۔

مسافر اس کی دل بستگی اور خوشنودی کے لئے دفتر سے واپس آنے کے بعد اکثر اُسے مشہور تفریح گاہوں اور گاہے گاہے سینما لے جاتا تھا اور وہ ان سے بڑی محظوظ ہوتی تھی لیکن جب آٹھ دس ماہ کے عرصہ میں وہ اسے مالابار ہل، ورلی، جوہو، باب الہند، میوزیم جیسے ان تمام قابل دید مقامات کی سیر کرا چکا جن کی تفصیل افسانہ نگار "چشم فسردہ" میں بیان کر چکا ہے تو گل شبنم کو اپنے دائرۂ حیات میں خلا سا معلوم ہونے لگا۔ ان پُر رونق جگہوں کی متواتر سیر سے اس کے لئے ان کی ندرت جاتی رہی اور اُسے ایسا محسوس ہوا کہ یہاں کے لوگ صرف ہنگامہ پرور زندگی پسند کرتے ہیں، تنہائی اور سکوت نہیں۔ جب بھی وہ مسافر کے ہمراہ جوہو کی ٹھنڈی ریت پر کھڑی ہوتی تو اس کا دل بے اختیار چاہتا کہ وہ بھی بحیرۂ عرب کی بے کراں وسعتوں میں بہت دیر تک غسل کرتی رہے، مگر وہاں کی چپقلش اور مردوں اور عورتوں کی باہم پُرشور غسل نوازیاں اُسے ایک آنکھ نہ بھاتیں۔ اس کا دل پھر اُنہیں شاموں کے لئے مچلنے لگتا جب وہ تن تنہا اور پوری

آزادی کے ساتھ کنول کے پتوں اور آبی بیلوں سے کھیلتی ہوئی آبشار کے دھارے پر نہایا کرتی تھی۔ یہی حال اس کے فلیٹ کے باغیچہ کا تھا جو مسافر نے عمارت کی سب سے آخری منزل پر اس کے لئے ترتیب دیا تھا۔ بے شک اس میں پونا کی نرسری سے لائے ہوئے رنگ برنگی پھولوں اور پھلدار پودوں کی کافی تعداد موجود تھی۔ لیکن الگ معلوم ہوتا تھا کہ ان میں وہ کثرت اور فراوانی وہ رعنائی اور نظر فریبی نہیں ہے جو جزیرۂ شبنم کی قدرتی کیاریوں اور کنجوں میں فطرت کا مالی از خود پیدا کرتا ہے۔ علاوہ ازیں جب نیچے کی ایک منزل میں کسی کا انتقال ہو گیا تو اُسے یہ دیکھ کر بڑا رنج ہوا کہ لاش اُٹھانے کے لئے چار آدمی بڑی مشکل سے جُڑتے ہیں۔ وہاں لوگ اس قدر ایک دوسرے سے بے تعلق اور انجان جو رہتے ہیں! چاہے کوئی عالمِ نزع میں ایڑیاں رگڑ رہا ہو مگر کوئی حلق میں پانی ٹپکانے والا ہمیں میسّر نہیں آتا۔ اور اس غیر انسانی ماحول سے وہ کچھ گھبرائی گھبرائی سی رہنے لگی۔ اس پر مستزاد کروڈ آئل (Crude Oil) کی دماغ کو اڑا دینے والی بدبو تھی جس سے بمبئی کی اکثر و بیشتر بسیں چلتی تھیں اور جب کوئی بس اُسکے پاس سے گذرتی تو اُس کا سر چکرانے لگتا تھا۔

پھر ایک دفعہ جب وہ مسافر کے ساتھ لیمنگٹن روڈ سے سینما دیکھ کر لوٹ رہی تھی اور سواری نہ ملنے کی وجہ سے اُن کو کچھ دُور پیدل چلنا پڑا تو وہ دونوں فاکلینڈ اور سفید گلی میں سے گذرے۔ سڑک کے دونوں جانب لوہے کے سلاخوں دار دروازے کے پیچھے کمسن، جوان اور ادھیڑ عمر کی عورتیں گھٹیا قسم کا رنگ روغن ملے اور سستے رنگین کپڑے پہنے گاہکوں کی منتظر بیٹھی تھیں۔ مسافر جلدی جلدی قدم اُٹھانے لگا کیونکہ وہ نہیں چاہتا تھا کہ گل شبنم ان کو پہچان جائے اور جان لے کہ کبھی ان کے دل میں بھی تقدس اور معصومیت کے چراغ روشن تھے مگر آج وہ دوشیزگی اور پاکی سے محروم صرف پیٹ کی خاطر اپنا باقی جسم نیلام کر رہی ہیں۔

ایک کمسن لڑکی نے جو اس تجارت گاہِ حسن و شباب میں نئی نئی وارد ہوئی تھی، آہنی سلاخوں کو دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر گل شبنم کو پُر معنی نظروں سے دیکھا اور اس کے لبوں پر ایسی طنزیہ مسکراہٹ آگئی جس نے اُسے پریشان سا کر دیا چنانچہ اُس نے مسافر کو جھنجوڑتے ہوئے پوچھا "انہیں کیا ہوا؟ یہ اس طرح کیوں بند ہیں؟"

مسافر کے خیالات اُلجھ گئے اور اُس نے مبہم الفاظ میں اُسے بتایا کہ چند ناگزیر حالات نے انہیں ان دروازوں کے پیچھے بند کر دیا ہے۔ معاً گل شبنم اپنے نازک اور ناتواں جسم کو دیکھ کر لرز گئی اور سہمی ہوئی آواز میں کہنے لگی "مجھے لے چلو۔ مجھے یہاں سے لے چلو۔ میری آنکھیں بند ہیں، میں ان صورتوں کو نہیں دیکھ سکتی۔"

الیکٹرک ٹرین اپنی پوری رفتار سے بھاگی جا رہی تھی اور مسافر گل شبنم کو فلم کا ایک مزاحیہ منظر یاد دلا کر ہنسانے کی کوشش کر رہا تھا کہ دفعتاً ٹرین بے ہنگام شور اور ایک جھٹکے کے ساتھ رُک گئی۔ کچھ دیر لوگوں کے غُل مچانے کی آواز آتی رہی۔ پھر یکلخت سناٹا چھا گیا۔ اور جب گاڑی پھر روانہ ہوئی تو برابر کے درجہ میں کسی نے غمگین لہجہ میں کہا۔ "باہر لٹک رہا تھا کھمبے سے ٹکرا کر مرا ہے۔"

کوئی اور شخص بولا۔ "بیچارے کا سر پاش پاش ہو گیا، صورت پہچانی نہیں جاتی۔"

اور گل شبنم نے مسافر سے ہاتھ چھڑا کر اپنے دل کو زور سے پکڑ لیا جو اختلاجِ قلب کے دورے کی طرح انتہائی تیزی سے دھڑک رہا تھا۔ اُس کے دست و پا سرد پڑ گئے اور اسکی آنکھوں میں وحشت ناچنے لگی۔

بمبئی کی تلخ حقیقتوں اور جیتی جاگتی ہولناکیوں نے گل شبنم میں یکسر تبدیلی پیدا کر دی اور وہ راتوں کو اٹھ اٹھ کر کئی کئی گھنٹے دریچے کے پاس کھڑی ماہم بیچ کی لہروں کے

پُرسوز نغمات سنتی رہتی۔ اُسے یوں معلوم ہوتا کہ اس کے اہلِ وطن نے ان لہروں کے ذریعے اس کو اپنا محبت بھرا پیغام بھیجا ہے۔ اور یہ میلوں مسافت طے کرنیوالی موجیں کیہال کنڈلا کی طرح اسے اپنے اندر بلا رہی ہیں۔

مسافر نے بے چینی سے کروٹ لیکر آنکھیں کھولدیں۔ اُسے اس بات کا بڑا رنج تھا کہ گلِ شبنم افسردہ و ملول رہتی ہے۔ اور وہ اب پہلے کی طرح اُس کی آغوش وا دیکھ کر مسکراتی ہوئی اُس کے سینے پر اپنا خوبصورت سر نہیں رکھ دیتی۔ اس کی ان خاموشیوں اور اُداس نظروں نے خود اس کے سُکھ چین کو رُخصت کر دیا تھا۔ اسلئے وہ بار بار اُس سے پوچھتا "تمہیں کیا ہو گیا ہے؟ تمہاری مسرت اور پہلی سی شوخیاں کدھر گم ہو گئی ہیں؟"

اور وہ چپ چاپ سب کچھ سنتی رہتی، لیکن اس کے سوالوں کا اس کے پاس کوئی جواب نہ ہوتا ـــــ اور اب جو اُس نے آنکھیں کھولیں تو دیکھا کہ گلِ شبنم اوس میں بھیگی ہوئی سوسن کی مانند سمندر کی طرف مُنہ کئے دریچے سے لگی کھڑی ہے اور بدر کامل کی اجلی اور روشن چاندنی شیواجی پارک کے مغربی گوشہ کی پاسبانی کرنے والے تاڑ کے درختوں میں سے چھن چھن کر اس پر پڑ رہی ہے۔ مسافر دبے پاؤں اُس کے پاس چلا آیا اور آہستہ سے کہا "گلِ شبنم! تمہاری خاموشی اور افسردگی نے مجھے مضطرب کر رکھا ہے۔ بتاؤ، بتاؤ، تم مجھ سے اسقدر دُور کیوں ہوئی جا رہی ہو؟"

پہلے وہ لاجونتی کی طرح خود اپنے میں سمٹ گئی، لیکن جب مسافر کے محبت بھرے اصرار نے اس کی ہمت بڑھائی تو اُس نے اپنی غزالیں آنکھوں سے اُسکو نگہ بھر کر دیکھا، اور اسکی چشمہائے سرمگیں میں آنسو جھلک آئے۔

مسافر اُس کے رُخساروں پر اپنی انگلیاں ہولے ہولے پھیرتے ہوئے بولا "کہو، میرے پھول کہو۔"

اور گل شبنم نے کہا، "مسافر! میں تمہاری بستی سے اُکتا گئی ہوں، میں ایک لمحہ بھی یہاں ٹھہرنا نہیں چاہتی۔ تم نے اس کمزور اور بے بس لڑکی کی طرح جو لوہے کے دروازے کے پیچھے بند تھی، مجھے اس شہری پنجرے میں بند کر دیا ہے۔ مجھے آزاد کر دو۔ وہ سامنے دیکھو! اسی شگوں سطحِ آب کے کسی کونے میں جزیرۂ شبنم ہے۔ وہاں میرا بوڑھا باپ، میری بیوہ اور بیاہی بہنیں، میرے بھائی اور میرے اہلِ وطن مجھے یاد کرتے ہیں۔ میں ان سب کو چھوڑ کر آ گئی ہوں۔ وہاں طلوع و غروبِ آفتاب کے نظارے، قدرت کی بے پناہ مسکراہٹیں اور میری چہیتی سہیلیاں میرا انتظار کر رہی ہیں۔ آہ، وہ جزیرہ مجھ سے جدا ہو گیا ہے۔ اور وہ جھرنا! وہ آبشار! وہ نہریں، مسافر یہ سب مجھے بلاتے ہیں۔ سنو، سمندر کی بے چین موجیں ان ہی کا پیغام لائی ہیں اور — وہاں میرا سب سے چھوٹا بھائی ہے۔ وہ چلنے پھرنے سے معذور ہے، اس کے ہاتھ بھی لُنجے ہیں۔ ماں نے مرتے وقت اُسے میرے ہی سپرد کیا تھا۔ ارے اس کی کون خبر گیری کرتا ہوگا — مسافر! میرے کانوں میں اس کی آواز گونج رہی ہے، شاید اُسے بھیّا نے مارا ہوگا.....!"

مسافر کی آنکھوں سے پردے اُٹھ رہے تھے، وہ اُسے جزیرے میں اکیلا کیسے بھیج دے، اور خود وہ اس کے ساتھ وہاں نہیں رہ سکتا کیونکہ — کیونکہ..... اسے سرائے کے بدمزاج مالک کا بڑا داماد یاد آ گیا۔ وہ اس قدر تذلیل اور بے بسی کی زندگی نہیں بسر کر سکتا۔ اور جب اس کے ہاں بچے پیدا ہونگے تو وہ کیسے برداشت کرے گا کہ وہ کیڑے مکوڑوں کی طرح ننگے دھڑنگے روتے بسورتے سرائے کے صحن میں رینگتے پھریں! پھر، وہاں رہ کر وہ پوستی نہیں ہو جائیگا؟ علاوہ ازیں اُسے اپنی محدود آمدنی سے تمام خاندان کی کفالت بھی تو کرنی پڑے گی! اور انعام میں بوڑھے کی خشمنا کی اور جگ ہنسائی عنایت ہو گی۔

گل شبنم پر گویا وجد طاری ہو گیا۔ وہ دُنیا و مافیہا کو بھولے ہوئے کہے جا رہی تھی۔

"...... اور وہاں گلفروش اپونی ہے۔ وہ مجھ سے بیحد محبت کرتا ہے۔ وہ کہتا تھا گلاب رو! تم مجھ سے ہی شادی کرنا، میں اپنی کشتی میں پھولوں کی سیج بچھا کر تمہیں چاندنی رات میں جھیل کی سیر کرایا کروں گا۔ لیکن جب میں اپنی رضامندی ظاہر کرنے والی تھی تو تم سیاحت کرتے ہوئے ہمارے جزیرے میں آ گئے اور میں تمہاری اجنبیت اور تمہارے نئے پن سے مسحور ہو گئی۔ تمہاری زبان سے اپنے حسن کی تعریف اور تم سے محبت کے فسانے سن کر میں تم پر ریجھ گئی۔ کیونکہ اپونی بالکل خاموش آدمی ہے۔ وہ مجھے دل سے چاہتا ہے مگر اس نے تمہاری طرح ایک دفعہ بھی بالکل میرے نزدیک آ کر نغمۂ الفت سنانے کی جسارت نہیں کی۔"

رقابت سے مسافر کے سینے میں زیر و بم ہونے لگا اور معاً اسے تامس ہارڈی کا ناول (Far From The Madding Crowd) یاد آ گیا۔ وہ سوچنے لگا کہیں یہ اپونی گبرئیل اوک کی طرح خاموش اور پُر تاثیر محبت کرنے والا تو نہیں، اور میں ـــ میں سارجنٹ ٹرائے کی طرح دل لبھانے والا عاشق، اور بالآخر گبرائیل اوک کی فتح کا خیال آتے ہی اس کے پیروں تلے کی زمین نکل گئی۔ اور جب گل شبنم نے کہا "آخری بار جب وہ مجھ سے بچھڑنے پر ملا تو اس نے مجھے اشک آلود نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہا، "گلاب رو! میرا دل گواہی دیتا ہے کہ تم ضرور ایک دن واپس آؤ گی، اور میں اس انتظار میں ہر روز تمہارے لئے اپنی کشتی میں پھولوں کی سیج بچھا کر جھیل کے اس کنارے پر آیا کروں گا" تو اس نے زور سے گل شبنم کا منہ بھینچ کر اسے آگے کہنے سے روک دیا۔

۴

دوسرے روز جب وہ دفتر گیا تو اس کی حالت اس بچے کی سی تھی جو آدھی رات کو کوئی بھیانک خواب دیکھ کر خوف اور ڈر سے کانپ اٹھتا ہے اور سنبھالے نہیں سنبھلتا، لیکن جب ایک بجے کے قریب خلاف توقع وہ گھر آیا تو اس کے چہرے پر اطمینان و سکون کی

بارش ہو رہی تھی۔ وہ خوشی سے ناچتا ہوا اندر آیا اور گل شبنم کو مخاطب کرکے ایسے پُراعتماد لہجے میں جیسے اُس کی تمام دشواریاں حل ہو گئی ہوں، کہنے لگا۔ "لو میں تمہیں ایک خوشخبری سناتا ہوں، یہ بمبئی جس سے تم اکتا گئی ہو اور جس کے گھناؤنے رُخ نے تمہیں اپنے جزیرے کی یاد دلادی ہے، ہم یہاں سے کل چلے جائیں گے۔ میرا تبادلہ دہلی کا ہو گیا ہے۔ دلّی! وہ پاک اور خوبصورت سرزمین میرا وطن ہے، اس کے تاریخی ماحول میں تمہیں سکون اور مسرت نصیب ہوگی۔ گل شبنم! میرے دل سے پوچھو، دلّی کے دیدار کی تمنا میں بمبئی کے یہ دن میں نے کس مصیبت سے کاٹے ہیں۔ یہاں کا ایک ایک لمحہ میرے لئے اذیت اور روحانی کرب کا باعث ہو رہا ہے۔"

لیکن مسافر کی خوشی سے اُسے کوئی خوشی نہیں ہوئی۔ اُس نے آہستہ آہستہ کہا۔ "وہاں جہاز کتنے گھنٹے میں پہونچ جاتا ہے؟"

مسافر اُسکی سادگی پر ہنس پڑا۔ "وہاں تو ریل جاتی ہے۔"

گل شبنم نے اپنی مایوسی اور دلی رنج کو چھپاتے ہوئے پوچھا۔ "تو تمہاری دہلی یہاں سے ہے کتنی دُور؟"

"کوئی ہزار میل ہوگی۔" مسافر نے تصوّر میں دلّی کی جھلکیاں دیکھتے ہوئے کہا۔ "جلدی سے جلدی چوبیس گھنٹے کا راستہ ہے۔"

پھر وہ اپنے چاروں طرف نظر دوڑاتے ہوئے بولا۔ "نوکر کی مدد سے تمام سامان بندھوا ڈالو۔ میں بھی آج دفتر سے ذرا سویرے چلا آؤں گا۔"

گل شبنم مسکرائی اور مسافر اس کی مسرّت سے مسرور و مطمئن، دفتر چلا گیا۔

جب وہ دفتر سے گھر واپس لوٹا تو اُسے فلیٹ کچھ سونی سونی سی نظر آئی۔ یکایک اُسے کچھ وہم سا آیا اور وہ نہایت سُرعت سے اپنی محبوبہ کو آوازیں دیتا ہوا گھر کے کونے کونے کو ڈھونڈنے لگا۔ آخر خوابگاہ میں اُس نے دیکھا کہ اس کے سرہانے ایک خط رکھا ہوا ہے جسے

اُس نے جلدی سے کھول کر پڑھا:۔

"اچھے مسافر اب مجھے معاف کر دو۔ میں اپنے جزیرے اور جزیرے والوں کو کبھی نہیں چھوڑ سکتی، اس لئے تم سے رخصت ہوتی ہوں۔

گُلِ شبنم"

وہ جس حال میں تھا اسی میں الیگزنڈرا ڈوک کی جانب لپکا مگر معلوم ہوا کہ تین بجے کا اسٹیمر چھوٹ چکا ہے۔ چنانچہ ایک لونچ میں بیٹھکر وہ جزیرہ اورن روانہ ہوا اور وہاں سے جس قدر جلد ممکن ہو سکا وہ جھیل تک پہنچ گیا، لیکن ـــــ لیکن اس کی نگاہوں نے اُس کا حوصلہ پست کر دیا، اس کی آس ٹوٹ گئی اور ایک پھولدار تناور درخت کا سہارا لیکر بیٹرس کو جاتے ہوئے دیکھکر دانتے کی مانند اُس نے اپنا دل بھینچکر پکڑ لیا۔ سامنے حسین و جمیل، رنگا رنگ پھولوں سے لدی ہوئی ایک سبک رو کشتی میں گُلِ شبنم سوئے وطن جارہی تھی اور اس کے پہلو میں نیم دراز اس کا دیرینہ پرستار محبت و کامرانی کا ترانہ گاتا ہوا کشتی کھے رہا تھا!

ـــــ یہ جزیرۂ شبنم کی کہانی ہے!

(۱۹۴۳ء)

دیوتا کی مُسکراہٹ

چند بھدّی سیٹیوں اور مشینی گڑگڑاہٹ کے ساتھ جہاز نے ساحل کو خیرباد کہا۔ اس کے عظیم الجثہ دانت سمندر کا سینہ چیرنے لگے جیسے وہ کوئی بڑا موٹا مہاجن ہے جو اب اپنے غریب قرضدار کا سارا لہو پیئے بغیر چین نہیں لے گا۔ بڑی بڑی موجیں اُس کے قدموں سے لپٹتیں، گویا اُسے اس بے رحمی اور ستمگری سے روک رہی ہیں مگر اس کا غصّہ بڑھتا ہی جاتا اور اس کے آہنی کناروں سے بُری طرح کف نکلنے لگتے۔ ساحل کی دُوری کے ساتھ ساتھ بمبئی کے مناظر آنکھوں سے اوجھل ہو رہے تھے اور جہاز کا کپتان شانِ بے نیازی کے ساتھ سوچ رہا تھا، یہ چھوٹی سی دُنیا اب میرے قبضے میں ہے۔ اس ساری مخلوق کا میں ہی خدا ہوں، چاہے انہیں جِلاؤں چاہے موت کی آغوش میں سُلادوں، اور میرے مقابلے میں وہ نکو باری خلاصی ہے جسے دُنیا میں کہیں ٹھکانا نہیں۔ انٹرپاس کر کے بھی اُسے اس سے بہتر نوکری نہیں مل سکتی۔ اس کا رزق کس قدر مجبور اور عزّت سے عاری ہے! اُسے دُنیا میں کوئی اعزاز حاصل نہیں۔ لوگ اس کی طرف اُمید اور التجا بھری نظروں سے کبھی نہیں دیکھتے۔ کوئی بھی تو ایسا شخص نہیں جو اس کے سہارے جی رہا ہو —— اور ایک میں ہوں، ذرا سمندر میں طوفان آجائے، جہاز کی کوئی کل ہی بگڑ جائے، اور پھر یہ ساری مخلوق، یہ تمام آبادی مجھ سے سلامتی مانگیگی۔ میری خیر منائیگی کہ میں ہی اُن کی بگڑی بنانیوالا ہوں، میں ہی اُنہیں مصیبت سے نجات دلاؤنگا۔

ـــــ اور جہاز کے مسافر، سر پھرے کپتان کے ہوائی قلعوں سے بے خبر، دُنیا کے بے ترتیب نظام سے لاپروا، اپنی اپنی دُھن میں محو تھے۔ بعض لوگوں کی نظر میں اس جہاز کی کوئی حقیقت نہیں تھی۔ آخر یہ اسٹیمر ہی تو تھا جس کے ذمے بمبئی کے سیلانیوں کو آس پاس کے جزیروں میں لے جانے اور لانے کی خدمت سپرد تھی اور بس، لیکن اُنہوں نے اس سے بڑے بڑے بلکہ جہازوں میں سفر کیا تھا جن کے مقابلے میں اس کی حیثیت کھلونے کی تھی۔ البتہ بعض مسافر اس جہاز کو بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھ رہے تھے، اور ان لوگوں میں زیادہ تعداد دفتر کے بابوؤں کی تھی۔ اُنہیں یہ ایک عجوبہ سا معلوم ہوا اور اس کی نقل و حرکت سے اُن کے دماغ میں تحریک ہونے لگی۔ اُنہیں اپنا پچھلا زمانہ یاد آیا جب وہ تعلیم پاتے تھے اور سمجھتے تھے کہ بی۔ اے کرکے آئی۔ سی۔ ایس کا امتحان دیں گے اور ٹریننگ کے لئے ولایت جائیں گے لیکن ایسا نہیں ہوا۔ افسری کے بجائے انہیں کلرکی ملی اور اب وہ اُس گورے ملکوں کو جانے والے دیو نما جہاز کے بدلے صرف ایک چھوٹے سے اسٹیمر میں ایلی فینٹا کی سیر کرنے جا رہے تھے۔ اُنہیں اسی میں لذت محسوس ہوئی اور کچھ دیر کے لئے وہ دُنیا اور آلامِ حیات کو بھول گئے۔ سمندر کی ہوا نے اُن پر سرور اور خود فراموشی طاری کر دی اور وہ چند لمحات کے لئے اپنے آپ کو دھوکہ دیتے ہوئے خیال کرنے لگے کہ وہ سچ مچ ولایت جا رہے ہیں اور یہ جہاز انہیں ہندوستان کی کالی سرزمین سے پاک صاف کر کے ایسی جگہ لے جا رہا ہے جہاں سے واپس آکر یہ یہاں کے کالے لوگوں پر حکومت کریں گے ـــــ مگر ایکا ایکی کپتان کی خود پرستی نے انہیں جگا دیا، ایک بھدّی سی گراں گوش سیٹی سے وہ چونک پڑے، خیالی اطمینان رخصت ہو گیا اور وہ پھر وہیں کے وہیں!

جہاز کی بالائی منزل میں کلرکوں کی ایک ٹولی، جیلخانے کے قیدیوں کی طرح، اتوار کی چھٹی کا زیادہ سے زیادہ لطف اُٹھانے کی کوشش کر رہی تھی۔ دو صاحب، جن کا حلیہ "سوشلسٹی ترقی پسند ادیبوں سے ملتا جلتا تھا، فلمی گانے گا رہے تھے اور اس طرح کہ

اُن کی دُھنوں میں ترمیم و تنسیخ کا فرض بھی بحسن و خوبی ادا کیا جا رہا تھا۔ ایک بابو، جنہیں موسیقی سے کوئی مناسبت نہیں تھی، پکّے گانے سے شوق فرما رہے تھے۔ باقی احباب عرشے کی جانب منہ کیے، جہاں ایک سیّاح لڑکی خاموش کھڑی سمندر کی نیرنگیوں کا تماشہ دیکھ رہی تھی، تکنے اور قہقہوں میں مصروف تھے۔ اُن کی گفتگو کا موضوع یہی لڑکی تھی۔ جیسے دیکھ دیکھ کر اُن کی باتوں میں جان اور جان میں اعادۂ شباب ہو رہا تھا۔ چنانچہ اُن کی آواز میں تصنّع اور الفاظ میں بازاری پن پیدا ہو گیا اور گاہے گاہے وہ بلند آواز سے فقرے بھی کسنے لگے۔ اُن کا خیال تھا کہ لڑکی اُن کی بے ہودہ گوئی اور بے ہنگام قہقہوں سے خوش ہو رہی ہے بلکہ کیا خبر وہ اُن سب پر عاشق ہی ہو جائے۔ اور ان لوگوں کو لذّتِ خیال میں سرپٹ دوڑنے سے روکنے والا صرف ایک شخص تھا۔ جیتن، جس کے متعلق سب کو معلوم تھا کہ وہ طبیعت کا شرمیلا اور عورت کے معاملے میں پارسا ہے۔ لیکن اسکو ٹوکنے پر حبیب، جو چھیڑ خانی میں پیش پیش تھا، بگڑ گیا اور جھلّا کر بولا "تم مجھے اس لئے روکتے ہو کہ خود تم میں جرأت نہیں۔ تم ڈرپوک ہو....." سکندر نے فوراً موقع شناسی سے کام لیا اور آگے بڑھ کر بیچ بچاؤ کر دیا۔ بات آئی گئی ہو گئی۔

سمندری لہروں کی مدھم رفتار نے اختتامِ سفر کا پیغام پہونچایا اور جزیرۂ ایلی فینٹا کی جھلکیاں آہستہ آہستہ نظر آنے لگیں۔ ساحلی میدان میں سرسبز اور شاداب درخت قطار اندر قطار کھڑے سرسرا رہے تھے اور اُن کے پیچھے چھوٹی چھوٹی پہاڑیاں سربلند کیے سرگوشی میں کہہ رہی تھیں "اے مسافر آؤ، بسر و چشم آؤ۔ ہماری آغوش میں ایک جوہر نایاب ہے، اسے پرکھو، اس کی جوت دیکھو اور اس کے متعلق اپنے تاثرات دُور دُور تک پھیلا دو۔ یہاں گہما گہمی نہیں۔ شہر کی رونق نہیں۔ بستی کی چہل پہل نہیں۔ بازاروں کی لہر بہر نہیں۔ بس سکون ہے۔ ایک ابدی سکون، جسے رشی اور سادھوؤں کی سالہا سال کی ریاضت نے حاصل کیا تھا اور جسے وہ نسلاً بعد نسلٍ تمہارے لئے ورثہ چھوڑ گئے ہیں۔ آؤ۔ بے خوف

چلے آؤ ۔۔۔ ان غاروں میں دیدۂ دل واکرنے والے کو قلبی اطمینان سے مالا مال کر دیا جائیگا. یہ اپلی فینٹا ہے!"

آخر کار دو گھنٹے کی مسافت کے بعد ساڑھے دس بجے کے قریب جہاز لنگر انداز ہوا اور کشتیاں باری باری مسافروں کو جہاز سے اُتار کر کناروں پر پہونچانے لگیں۔ ملّاحوں نے اعلان کیا کہ جہاز مسافروں کو واپس لے جانے کے لئے شام کو چھ بجے یہ آئیگا. سب وقت پر پہونچ جائیں ورنہ دوسرے دن تک یہیں رکنا پڑیگا.

لوگوں نے کچھ سُنا کچھ نہیں سُنا. ایک افراتفری مچی ہوئی تھی. جہاز خالی کیا جا رہا تھا. خلاصی اور کشتی بان مسافروں کو سہارا دیکر جلدی جلدی اُتار رہے تھے. اسی بھاگم دوڑ میں اس سیّاح لڑکی کا نمبر آیا اور وہ بچتی بچاتی جہاز کے دروازے پر آئی. ایک بدصورت مگر قوی ہیکل کشتی بان نے اس کو سہارا دیا لیکن ہندوستانی اپنی روایتی بے ترتیبی سے اس بُری طرح ایک دوسرے کو دھکّا دے رہے تھے کہ اس لڑکی کا پاؤں پھسل گیا اور معاً وہ کشتی بان کی گود میں آن پڑی. کلرکوں کی ٹولی میں گویا کسی نے شرارہ پھینک دیا اور اُن کے دل میں تمنّا پیدا ہوئی کہ کاش وہ بدصورت مگر قوی ہیکل کشتی بان ہوتے جو یہ سعادت اُن کو نصیب ہوتی.

(۲)

کشتیوں سے اُتر کر چٹانوں اور پہاڑیوں پر چڑھائی ہوتی رہی. ہر آگے بڑھتا ہوا قدم سمندری نشیب سے سطحِ مرتفع کی جانب لئے جا رہا تھا. کہیں سانپ کی مانند بل کھاتے ہوئے ناہموار راستے تھے اور کہیں گھنی جھاڑیوں سے گھری ہوئی تنگ پگڈنڈیاں. کبھی کبھی دو چار فرلانگ کے فاصلے پر پہاڑی قبیلوں کی عورتیں اور بچے اپلی فینٹا کی مخصوص ٹیڑھی میڑھی اور چکنی لکڑیاں بیچتی ہوئی مل جاتی تھیں. لوگ ان لکڑیوں کو ازراہِ تفنّن خریدتے اور انہیں نکیلے پتھروں پر پٹختے اور طرح طرح کی آوازیں نکالتے چلے

جاتے تھے۔ اُن کی حرکتوں سے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ آج کے دن وہ اپنی عمروں کو بھول گئے ہیں۔ بلکہ اُن کو یہ بھی یاد نہیں کہ اُن کی یہ بے فکری اور خوش باشی عارضی ہے، کل پھر پیر ہوگا، اور پھر وہی دفتر کی، اُمنگوں کو کچل دینے والی، بیزار کن فضا۔ کلرکوں کا قافلہ یوں ہی شرارتیں کرتا، سیٹیاں بجاتا، اور مختلف النوع نعروں کی نقلیں اُتارتا چڑھائی طے کر رہا تھا کہ جنگلی شہتوت کے سامنے سے جہاں دو راستے اس طرح آکر ملتے تھے جیسے زاویہ بنانے والے دو خطوط، جہاز کے ہم سفروں کی ایک اور ٹولی آتی نظر پڑی اور پیچھے پیچھے وہی پارسی سیّاح لڑکی! نیلی پتلون اور شربتی قمیص پہنے ہوئے۔ بوٹ قدرے مردانہ وضع کا۔ بال کترے ہوئے، رنگ صندلی، چہرہ دلکش، خدوخال ذہانت اور علمیت کے پیامی۔

جین نے اس کا سراپا نظر بھر کر دیکھا۔ اُس کی حسین صورت اُسے بیحد بھلی معلوم ہوئی اور اس نے اپنے دل میں سوچا کہ نسوانیت کی تمام رعنائیاں ان نقوش میں سمٹ آئی ہیں۔ اس کے رُخساروں کے اُجلے پن نے اُسے یوکلپٹس کے تنے کا بیرونی رُخ یاد دلا دیا جسے دیکھ کر نورِ سحر کا گمان ہوتا ہے۔ اور اُس کے لب اُسے ایسے معلوم ہوئے جیسے کسی نے کاشمیری سیب کی دو پتلی پتلی خوبصورت قاشیں نفاست اور نزاکت سے تراش کر پاس پاس رکھ دی ہیں۔ پھر اُس کی نگاہ اس کے سینے پر گئی اور ایک لمحے کے لئے وہ ذرا مایوس سا ہوگیا۔ کیونکہ وہاں اُس نے وہ بلّوریں آبگینے نہیں دیکھے جنہیں دوشیزگی اور شباب و جمال کا خزینہ کہا جاتا ہے، لیکن فوراً ہی وہ اس کی مستی سے لبریز چال کو دیکھ کر اُس کے سپاٹ حصۂ جسم کو بھول گیا اور اس کے دل میں آئی، کاش یہ ایک دفعہ میرے قبضے میں آجائے۔ مجھے اس پہ تصرف حاصل ہو جائے۔ میں اسے اپنی آغوش میں لے لوں اور اس قدر بھینچوں، اس قدر بھینچوں کہ یہ چند لمحات کے لئے بالکل مجھ میں سما جائے.....

وہ یونہی اپنی حریص نظروں سے اس کا حسن میلا کئے جا رہا تھا کہ معروف نے اُسے ٹھوکا

دیا۔ "کیا گھور رہے ہو؟" اور جتین شرما گیا۔ چھوئی موئی کی طرح گویا خود اپنے میں سمٹنے لگا۔ وہ کبھی یہ نہیں چاہتا تھا کہ کوئی اُسے یوں چوری کرتے ہوئے پکڑے۔ وہ سوچنے لگا، یہ معروف اپنے دل میں کیا کہتا ہوگا۔ یہ تو سمجھتا ہے کہ میں عورت کو دیکھنا بھی حرام سمجھتا ہوں ـــــ

دو گھنٹے کے بحری سفر کی مانند، پون گھنٹے کی برّی اور پہاڑی مسافت بھی آخر ختم ہوگئی۔ اب راستہ ہموار ہوگیا تھا اور صاف ستھری سڑک کے دونوں جانب سایہ دار درخت کھڑے ہوئے تھے۔ منزلِ مقصود پر پہونچکر سب نے ذرا کی ذرا دم لیا اور سیلانی جیوڑوں کی طرح انہوں نے چاروں طرف ایک نگاہِ غلط انداز ڈالی۔ سامنے دُور دور تک پھیلی ہوئی پہاڑیاں اور اُن کے آگے بحرِ ناپیدا کنار موجیں مار رہا تھا اور پُشت کی جانب وہ وسیع و عجیب بُت گاہیں تھیں جو غارہائے ایلی فینٹا کے نام سے مشہور ہیں۔ لوگ باگ دروازے پر سرکاری نذرانہ دیکر اپنی اپنی ٹکڑیوں کے ساتھ اندر داخل ہوگئے۔ پہلے وہ بڑے بڑے صحنوں میں آئے جہاں تمازتِ آفتاب کے باوجود ٹھنڈی ہواؤں اور روایتی خاموشی نے اُن کا استقبال کیا۔ پھر وہ آہستہ آہستہ مختلف غاروں میں گھس گئے جہاں کہیں کہیں کافی تاریکی اور زیادہ تر کچھ ایسا سماں تھا جیسے نورِ ظہور کے وقت ہوتا ہے۔ ان غاروں میں موٹی موٹی دیواروں سے پیٹھ لگائے بیسیوں مجسّمے کھڑے تھے جن کے نیچے سیاہ تختیوں پر سفید حروف میں ان کا مختصر سا حال درج تھا۔ بعض کوٹھڑیوں میں مہاتما بدھ، جنہوں نے بدّھی عقیدے کے مطابق تمام انسانوں کو نور بخشا۔ پتھریلے روپ میں اپنے مخصوص انداز سے تشریف فرما تھے۔ ان کے جلوے خاص طور پر سکون اور سکوت تھا، اور لوگوں کی بلند آواز گفتگو بالعموم یہاں سرگوشیوں میں تبدیل ہوجاتی تھی، ورنہ دوسرے غاروں میں، مذہب سے لاپروا نوجوان، دیوتا دل

کے مجسموں کی ساخت اور اُن کے حالات پر تبصرہ کرتے ہوئے ہر قسم کی باتیں کرتے تھے۔ بعض لوگوں کو تعجب تھا کہ یہ غار اور یہ عظیم الشان بُت سالہا سال پہلے کس طرح تراشے گئے؟ اور جو ذرا قدامت پرست اور محب وطن تھے انہوں نے آپس میں سرد آہیں بھر کر کہا آہ! ہندوستان کا یہ ہنر مٹ گیا۔ بھلا بتاؤ تو دُنیا کی اور کس قوم نے بغیر اوزاروں اور مشینی آلوں کے پہاڑوں کو موم کی طرح کاٹ کر یہ کمالات دکھائے ہیں؟

—— اور کلرکوں کی ٹولی اس سیاح لڑکی کے پیچھے پیچھے پہاڑی مناظر اور پتھریلے بُتوں کا معائنہ کرنے میں مصروف تھی۔ جب وہ اپنے شانوں سے لٹکے ہوئے بیگ میں سے کیمرہ نکال کر کوئی تصویر کھینچتی یا کسی مجسّمے کے امتدادِ زمانہ سے ٹوٹے ہوئے حصّوں کو دلچسپی سے دیکھتی تو وہ ضرور کوئی نہ کوئی فقرہ چست کر دیتے۔ لڑکی چپ رہتی۔ اُس کی نظر میں وہ کوئی اہمیت نہیں رکھتے تھے، شاید وہ ایسے منچلے نوجوانوں کی اوچھی حرکات کی عادی تھی۔ اسی لئے اُس نے پلٹ کر ان کو دیکھا تک نہیں، لیکن جبّین کا ذہن اندر ہی اندر منصوبے گانٹھ رہا تھا۔ ایک دفعہ وہ اپنے گروہ میں نکل کر ذرا آگے بڑھا، گویا اُسے اس دیو نما مجسّمے سے خاص دلچسپی ہے۔ جس کے آگے وہ لڑکی محو کھڑی تھی۔ پھر وہ اس کی لوح پڑھنے کے بہانے ذرا اور آگے سرکا اور بے دھیانی کا سوانگ بھر کے ایکا ایکی سیاح لڑکی کے سامنے کنّی کاٹ گیا۔ ایک ساعت کے لئے دونوں کی آنکھوں نے ایک دوسرے کو دیکھا اور پھر بھولا بھالا جبّین صفائی کرنے کے لئے اپنے دوستوں میں آملا جو اُس کے متعلق باتیں بنانے لگے تھے۔

اب سب سے آخری بُت کی باری تھی جو خانقاہ کے صدر مقام پر نصب تھا اس کے سامنے طویل و عریض بارہ دری تھی جس کا فرش پہاڑی کنکروں کو کوٹ کر

مضبوط اور ہموار بنایا گیا تھا۔ اس کے نصف حصّے میں جس کے تینوں طرف اُونچے اُونچے پہاڑ تھے دُھوپ خوب کھلی ہوئی تھی۔ لیکن دوسرے نصف حصّے میں جہاں چھت پٹی ہوئی تھی اندھیرا چھا رہا تھا۔ خود خانقاہ کے اندر تاریکی تھی البتہ اس بُت کے عین سر کے اوپر پہاڑی چھت کو کاٹ کر بارہ انچ قطر کا ایک سوراخ بنایا گیا تھا جس میں سے دن کو سورج اور رات کو چاند کی روشنی سیلاب کی طرح اندر آتی اور بُت کے آس پاس کے حصّے کو خوب روشن کر دیتی تھی۔ اس بُت کو دیکھکر سارے کلرک دنگ رہ گئے۔ یہ کسی دیوتا کا قومی ہیکل اور پُرہیبت مجسّمہ تھا۔ عام مجسّموں سے ڈیوڑھا اور دبدبے میں سب پر حاوی۔ اُسکی ساخت محیّر کن تھی، یعنی ـــــ اس کا نصف، دایاں حصّہ مردانہ تھا اور نصف، بایاں حصّہ زنانہ۔ اس کے سینے کی بائیں جانب ایک کسی ہوئی، سخت و تند چھاتی تھی اور دائیں طرف کا سینہ اس قدر مردانگی کا مظہر تھا گویا وہ عورت سے بالکل بے نیاز ہے۔ اس کے کھڑے ہونے کا انداز رقص کا تھا۔ اس کی دائیں مردانہ ٹانگ، بائیں زنانہ ٹانگ پر چڑھی ہوئی تھی۔ اس کے ہاتھوں اور اُنگلیوں کی ساخت سے ناچ کی ادا ظاہر ہوتی تھی، اور اس پر سرسری نظر دوڑانے سے یہ محسوس ہوتا تھا کہ عورت و مرد کا یہ متصل جوڑا کوئی دم میں حرکت کرنے والا ہے۔ پھر اس کا رقص شروع ہو جائے گا، وہ رقص جو ابتدائے آفرینش سے مذکر و مؤنث کی تخصیص و تخلیق کے لئے جاری و ساری ہے۔

ـــــ اور رحیم کو ہنسی چھوٹ پڑی۔ کہنے لگا "یار کو سوجھی خوب ! ــــ اس بُت کے بنانے والے کو ضرور مکتی مل گئی ہوگی !"

جین چپ چاپ کھڑا تھا۔ اُس کی آنکھیں دیوتا کے مجسّمے پر گڑی ہوئی تھیں۔ وہ کبھی اُس کے چہرے اور سینے کو دیکھتا اور کبھی اُس کے پیٹ اور ٹانگوں کو۔ اس کی زبان گنگ تھی، لیکن اس کا دماغ خیالات کی آماجگاہ بنا ہوا تھا۔ اُسے محسوس ہوا کہ اس کا سارا سر گھوم رہا ہے۔ خیال اپنی پوری تیز رفتاری سے گردش کئے جا رہا ہے، اور اس گردش کا

ایک مرکز ہے، یہی بُت! اور اس کی ساخت!!۔۔۔۔۔۔ خلیل کے قہقہے پر وہ چونکا۔ ہر شخص کچھ نہ کچھ تنقید کر رہا تھا اور یہ خیال کئے بغیر، کہ ہمارے گروہ میں ایک لڑکی بھی ہے جو چُپ چاپ اس مجسّمے کو دیکھے جاتی ہے مگر چہرے سے کوئی اثر ظاہر نہیں کرتی۔

قیوم نے جتین کو غوطے میں دیکھکر تفریحاً کہا "بھئی ہمیں تو تمام نماروں میں بس یہی ایک چیز پسند آئی، پکنک کے سارے دام وصول ہو گئے"

جتین ذرا ہوشیار ہوا اور ازراہِ تمسخر کہنے لگا "میں ایک بات سوچتا ہوں ۔۔۔ اگر اس مجسمے کی تقسیم داتیں بائیں کی بجائے اُوپر نیچے ہوتی تو بہتر ہوتا!"

یہ فقرہ اس کے منہ سے بے ساختہ نکلا تھا اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ مجسمے نے اُسے جس تفکّر پر مجبور کر دیا تھا وہ اُس کا مذاق اُڑا رہا ہے۔

حکیم نے اس رائے کی توضیح کرتے ہوئے پوچھا "یعنی بالائی حصّہ مرد کا اور زیریں عورت کا ہوتا!"

جتین نے قہقہہ لگایا اور ہنسے چلا گیا "نہیں نہیں۔ بلکہ بالائی حصّہ عورت کا اور زیریں مرد کا ہوتا!!"

سیّاح لڑکی کے لبوں پر ایکا ایکی مسکراہٹ سی آئی مگر وہ فوراً اُسے چھپا گئی۔ اُسکے پاؤں تھک گئے تھے، اس لئے وہ وہاں سے ہٹ کر ایک تنہا کونے میں چلی گئی اور ایک چوکور سُتون سے لگ کر بیٹھ گئی۔ جتین کے احباب کھانے پینے کا اہتمام کرنے خانقاہ کے باہر کھلے میدان میں چلے گئے مگر وہ اُن کی نظر بچا کر وہیں رہا اور کنکھیوں سے دیکھنے لگا کہ وہ لڑکی اس طرح بیٹھی ہوئی ہے کہ اس کی پتلون سرک کر اُوپر گھٹنوں تک چڑھ گئی ہے۔ اس کی گوری گوری پنڈلیاں دیکھکر جتین کو فوراً اپنے داتیں ہاتھ میں اس چکنی اور سڈول بید کا خیال آیا، جو اُس نے ایک پہاڑی عورت سے راستے میں خریدی تھی اور یکبارگی اس کا دل چاہا کہ اس چکنی لکڑی کو ان ننگی پنڈلیوں میں پھنسا دے!

۳

اور جب تک وہ دفتر کے بابو غار ہائے ایلی فینٹا کے گرد و نواح میں دشت نوردی کر کے خانقاہ واپس لوٹے، دھوپ ڈھل گئی تھی اور آفتاب غروب ہو رہا تھا۔ کھانے سے فراغت پا کر وہ سستانے ذرا بھی نہیں لیٹے بلکہ اپنی چہلوں میں محو، فوراً ہی سیر کے لئے چل کھڑے ہوتے تھے۔ چنانچہ اب جو وہ دور دور کی تفریحی مہمیں سر کر کے آئے تو ان کے پاؤں تھکن محسوس کرنے لگے اور ان کے گھٹنے مسلسل حرکت سے بوجھل ہو گئے۔ پھر انہوں نے اپنے چاروں طرف خاموشی دیکھی۔ شیشم اور نیم کی ٹھنڈی چھاؤں میں اب کہیں بھی کوئی گروہ آباد نہیں تھا۔ تمام سیلانی ساحل کی طرف روانہ ہو گئے تھے اور غاروں کی بیرونی صحنچیاں خالی رہ گئی تھیں۔ چھ بجنے والے تھے اور جہاز کی روانگی قریب آ گئی تھی۔ یکایک انہیں احساس ہوا کہ اگر ہمیں دیر ہو گئی اور جہاز ہمیں یہیں چھوڑ گیا تو کل غیر حاضری کا کیا انجام ہو گا اور یہ رات کہاں بسر ہو گی؟ یہ سوچتے سوچتے ان کے قدموں میں جنبش ہوئی اور وہ جلدی جلدی پہاڑیوں پر سے اترنے لگے۔

لیکن نہیں ــــــ باوجود ڈھلان کے ان کی تیز گامی کام نہیں آئی۔ انکو پہونچتے پہونچتے جہاز نے ایلی فینٹا کا ساحل چھوڑ دیا۔ اور وہ کلرکوں کی ٹولی دیکھتی کی دیکھتی رہ گئی۔ ساحلی دلدل کے کنارے اور سلسلہ ہائے کوہ کے دامن میں بس اکا دکا لوگ نظر آتے تھے، باقی سارا علاقہ سنسان اور سونا معلوم ہوتا تھا۔ انہوں نے سوچا اب یہیں رات کاٹنی ہے، اس لئے اس ٹیلے پر چلے چلیں جس کے قریب نیبو اور بیل کے سرسبز درختوں کی قطاریں ہیں۔ وہی جگہ محفوظ رہے گی۔ ممکن ہے کل صبح کسی جزیرے سے کوئی جہاز آتا ہوا مل جائے تو ہم فوراً اس میں سوار ہو جائیں اور جب وہ سب ہارے ہوئے کھلاڑیوں کی طرح سبز پوش ٹیلے کی جانب روانہ

ہونے لگے تو یکایک اُنہیں معلوم ہوا کہ جنین ابھی ابھی کہیں غائب ہو گیا ہے۔ اور اس کے اس طرح سرک جانے کی کسی کو خبر بھی نہیں۔

خانقاہ کے پھاٹک تک پہونچتے پہونچتے وہ سیّاح لڑکی بے حال ہو گئی۔ اتنی طویل چڑھائی پر پوری طاقت سے بھاگنے سے اس کا سانس پھول گیا، اور جب وہ بند پھاٹک پر سے اندر کودی تو اُس سے اُٹھا نہیں گیا اور وہ وہیں ڈھیر ہو گئی۔ ہر چہار طرف سنّاٹا چھایا ہوا تھا، اور خانقاہ کی صحنچیاں چاندنی رات میں صاف و شفاف نظر آ رہی تھیں۔ اُس نے گھبرا کر گردن اُٹھائی اور جنین کو اپنے تعاقب میں آتے ہوئے دیکھ کر سوچنے لگی اب میں کہاں پناہ لوں؟ مجھے کون اس سے بچائے گا؟ اور وہ بجلی کی سی سرعت سے بھاگی بھاگی خانقاہ کی بارہ دری میں پہونچ گئی جس کے اندرونی حجرے میں غار ہائے ایلی فینٹا کا سب سے عجیب و غریب اور انتہائی خوفناک بُت۔ زنانی ٹانگ پر مردانی ٹانگ رکھے بے پناہ ہیبت و جلال کے ساتھ کھڑا تھا۔ یہاں کی ششدر کُن اور پُر سحر فضا سے اُسے بڑی ڈھارس بندھی اور اُسے یقین ہو گیا کہ اب وہ دیوتا کی حفاظت میں ہے۔ اُسے اب کوئی نہیں ستا سکتا ——— لیکن جب اُس نے جنین کو بے قابو وحشی کی طرح بارہ دری میں بھی پھلانگتے ہوئے دیکھا تو وہ سہم گئی۔ اس کی مدافعتی قوتیں تو اسی وقت سلب ہو گئی تھیں جب جہاز کے چھوٹ جانے پر، اُس نے یہ سمجھتے ہوئے کہ اُس کے لئے محفوظ ترین مقام یہی غار ہیں وہ یہاں آ رہی تھی ——— کہ راستے میں جنین نے اپنی بہیمانہ دیوانگی میں اُسے اپنے سینے سے لگانا چاہا اور وہ بصد مشکل اس کے چنگل سے نکل کر بھاگی تھی۔ اب جو اُس نے اِس تنہائی اور خاموشی میں اُسے دیکھا تو اُس نے جان لیا کہ اب اس میں اپنی حفاظت کی طاقت نہیں رہی۔ چڑھائی، گذشتہ مدافعت اور ڈر سے اُس کے سب کس بل نکل گئے....

آخر اُسے ایک بات سوجھی اور وہ اُسے بہلانے کے لئے اُس کے نزدیک آتے ہی مسکرانے لگی۔

اُس نے کہا "یہ جگہ بڑی سحرناک ہے۔ یہاں صفحۂ تاریخ کے گمشدہ حروف منقش ہیں۔ آیئے انہیں دیکھیں"

جلین نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اُس نے دیکھا کہ اس لڑکی کی پتلون گھٹنے پر سے پھٹ گئی ہے اور چھل جانے سے اس کے خون نکل رہا ہے۔ خُون دیکھکر اُس کی حیوانیت کو اور بھی مہمیز لگی اور وہ بغیر اس کی بات پر توجّہ دیئے اس کے بالکل قریب آگیا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس کے دل و دماغ سے عوائدِ رسمیہ اور اخلاق و توجیہات یک قلم مٹ گئی ہیں اور وہ اس لڑکی میں سوائے اپنی نفسانیت کے سامانِ سکون کے اور کچھ نہیں دیکھ سکتا۔ چنانچہ اُس نے زبردستی اس کی کمر کے گرد حلقہ ڈال دیا اور گھٹی ہوئی آواز میں کہنے لگا "تم مجھ سے علیحدہ ہونے کی کوشش نہ کرو۔ تم مجھ سے بچ نہیں سکتیں"

اُس سیاح لڑکی نے ڈری ہوئی ہرنی کی طرح اُسے ایسی نظروں سے دیکھا جو فریاد کر رہی تھیں کہ اے ظالم! مجھ پر رحم کر ــــــ اور وہ اپنے حواس قائم رکھتے ہوئے بولی "آپ کے ساتھی کہاں ہیں؟"

جلین نے لاپرواہی سے جواب دیا "وہ ساحلی میدان میں ہیں ــــــ جہاز کے چھوٹنے کے بعد میں نے تمہیں ادھر آتے ہوئے دیکھ لیا تھا، اس لئے میں انہیں چھوڑ کر تمہارے پیچھے پیچھے چلا آیا ــــــ ذرا میری گود میں لیٹ جاؤ"

یوں دھکیل دینے سے لڑکی کو غصّہ آگیا مگر وہ اپنی جانب میں عقلمندی سے کام لیتی رہی اُس نے کہا "انسان کے پاس صرف جسم ہی تو کل کائنات نہیں۔ اسکی دوسری صلاحیتوں پر بھی تو نظر رکھنی چاہیئے" پھر وہ کسمسائی اور اپنے آپ کو آزاد کرنے کی

کوشش کرتی ہوئی بولی "آپ مجھے چھوڑ دیجئے۔ یہ دیکھیے، میرے پاس یہ ننھا سا ارغن ہے۔ میں اُسے بجانا جانتی ہوں۔ مجھے ہندو کلاسیکل رقص بھی آتا ہے۔ میں گا بھی سکتی ہوں۔ یا آپ چاہیں تو ہم دونوں کسی موضوع پر بحث بھی کر سکتے ہیں ــــــ بس اس طرح یہ ساری رات خوش و خرم گذر جائے گی ـــ آپ مجھے چھوڑ دیجئے !!....."
مگر اس کی التجا بیکار رہی۔ اُس نے اُسے اُٹھنے نہیں دیا اور کوشش کرتا رہا کہ اُس کے صندلی رخساروں پر اپنے لب رکھ دے۔

پھر اُس نے اُس کی قمیص کو پتلون میں سے جھٹکا دیکر نکالتے ہوئے کہا "مجھے کچھ اور نہیں چاہیئے۔ تمہاری قابلیت کے بجائے مجھے تمہارا جسم درکار ہے۔ تمہارے ناچ سے میری تسکین نہیں ہوگی، تم بغیر کسی رکاوٹ کے اپنا بدن میرے حوالے کر دو یہی میرے نزدیک رقصِ مجسم ہے۔ تمہارے باجے سے میری پیاس نہیں بجھ سکتی۔ یہ ہاتھ ہٹاؤ، تمہارے سینے کا زیر و بم ہی میرے لئے مستقل موسیقی ہے......" اور سینہ دیکھتے دیکھتے اس کی پلکیں جلدی جلدی جھپکنے لگیں۔ اُس نے دیکھا کہ اُس سپاٹ حصۂ جسم میں تناؤ اور کرختگی آگئی ہے اور آہستہ آہستہ وہاں دو گول اور سخت چھاتیاں نمودار ہو گئی ہیں۔ اس کی رگ رگ میں جوش پیدا ہو گیا۔ آنکھوں سے چنگاریاں برسنے لگیں اور اس کا خون کھولتے ہوئے سیال مادّے کی طرح اسکے عضلات میں حرارت و اضطراب پیدا کرنے لگا۔

لڑکی بے بس اور نڈھال ہو کر نیچے گر پڑی اور جونہی جَین نے اس کا لباس اُتار کر پھینکا اُسے پیچھے سے ایک خوفناک ہنسی سنائی دی۔ وہ سراسیمہ ہو کر ایکا ایکی گھوم گیا اور دیکھا کہ اس عجیب و غریب خوفناک دیوتا کے لبوں پر طنزیہ مسکراہٹ کھیل رہی ہے اور چاندنی کے سیلاب میں اس کے نسوانی اور مردانہ اعضاء مائل بہ جنبش ہیں۔ لیکن جَین سنبھل گیا اور اُس نے دیوتا کی مسکراہٹ کو واہمہ قرار دیکر ٹال

دیا۔ اُس کی شیطانی رغبتیں بھڑ کے سے مجتمع ہو گئیں اور وہ ایک غیر مہذّب وحشی کی طرح اس سیّاح لڑکی پر لوٹ پڑا۔ مگر، مگر......

خوف اور ہیبت سے اُس کی پتلیاں اُوپر چڑھ گئیں۔ جبڑا چڑ گیا اور سارے بدن پر مُردنی چھا گئی ـــــ اُس نے ایک ناقابلِ یقین منظر دیکھا تھا۔ ناقابلِ یقین۔ لیکن سچ بالکل سچ.... یہ کہ اس برہنہ لڑکی کے جسم کا بالائی حصّہ زنانہ ہے اور زیریں مردانہ!!

(۱۹۴۲ء)

چشمِ فسُوں

چندن اور سوشیل شہ نشین میں آبیٹھے۔ برابر کے کمرے میں خود بخود بجنے والا ارغن اپنے سُریلے سُروں میں دلکش نغموں کی بارش کر رہا تھا۔ نچلی منزل کے آگے مختصر سے شاخسار میں رنگ برنگی شاداب پودے ہوا کی لہروں سے اٹھکھیلیاں کر رہے تھے اور تھوڑے فاصلے پر سمندر، اتھاہ اور ناپیدا کنار سمندر تھکی ہوئی رقاصہ کی طرح ہولے ہولے ہلکورے لے رہا تھا۔

وہ دونوں ایک دوسرے کو دل و جان سے چاہتے تھے۔ خصوصاً سوشیل کو چندن سے بے حد محبت تھی۔ ان کی شادی کو زیادہ عرصہ نہیں ہوا تھا۔ مگر سوشیل کی وارفتگی اس سطح پر تھی جہاں لوگ بالعموم اپنی رفیقۂ حیات کے ساتھ ایک مدت دراز گذارنے کے بعد پہنچتے ہیں۔ وہ ابھی نوجوان تھا اور اُس کی زندگی ہمیشہ سے پُر مسرت و مطمئن تھی لیکن وہ سمجھتا تھا کہ یہ سب کچھ اُسے چندن ہی کی بدولت ملا ہے۔ گویا انہوں نے بہت دنوں سے زندگی کے اندھیرے اور اُجالے یکجا بنائے ہیں۔ اور اب وہ زمانے کی گردشوں سے نکل کر چندن کی صحیح قدر و منزلت کرنے لگا ہے۔ اور چندن اس قدر و محبت کی تھی بھی مستحق، کیونکہ تعلیمیافتہ اور ترقی پسند ہونے کے باوجود اس کی سیرت بے انتہا پسندیدہ تھی اور اس کا حسن دلکش و دلفریب! بات بات میں مسکراہٹ، اور متانت آمیز شوخیاں اس کا عام شیوہ تھا۔

خفگی اور بدمزاجی تو اسے آتی نہیں تھی۔ غرض وہ سراپا تبسم زار اور اخلاق و محبت کا ایک حسین پیکر تھی جس کی دل نشیں اداؤں سے سوشیل کا سرمایہ حیات حد درجہ پُرکیف اور منوّر تھا۔ اُس نے چندن کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ اور اُس کی بڑی بڑی خوبصورت آنکھوں میں محبت کی بے پناہ روشنی جگمگانے لگی۔

"وہ دیکھو!" سوشیل نے سمندر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "وہ، جہاں سطح آب اور دامنِ فلک یکجان ہو رہے ہیں۔ بس اسی طرح ہماری روحیں آپس میں متحد ہو گئی ہیں اِ خدا کرے ہمارا یہ ملاپ تمام عمر قائم رہے۔ اور ہم دونوں کے دل ہمیشہ ایک دوسرے کی دھڑکن سنتے رہیں۔"

چندن نے اُس کے بھولے مکھڑے کو نظر بھر کے دیکھا۔ وہ سوچنے لگی: "یہ خاموش محبت آج گویا کیوں ہے؟ آج تک انہوں نے اپنی اُلفت کا یوں کھُل کر اظہار کبھی نہیں کیا۔ ہمیشہ چُپ چاپ چاہتے رہے۔ اور مجھے ان کی بے پناہ چاہت کا اچھی طرح احساس ہے پھر یہ اظہار کیوں؟" اور جب اُس نے حسبِ معمول ایک دلفریب مسکراہٹ کے ساتھ ذرا لجاکر کہا: "آج آپ یہ کیسی باتیں کر رہے ہیں؟" تو وہ شرمندہ سا ہو گیا۔ گویا اُسکے منہ سے کوئی عریاں بات نکل گئی ہے۔

سمندر کے کنارے ایک ناریل اٹھلاتا، ناچتا، گاہے ڈوبتا، گاہے اُبھرتا، شفق کے دُھندلکے میں سوئے مشرق چلا جا رہا تھا کہ دیکھتے دیکھتے اُس کے چاروں طرف ننھے ننھے گرداب پڑنے لگے اور پہلو میں ایکا ایکی ایک بہت بڑی موج طوفانی شور و غل کے ساتھ ساحل سے آکر ٹکراتی۔ سوشیل کو بڑا لطف آیا اور وہ چندن کو اٹھاتے ہوئے بولا: "آؤ، ذرا پرے چلیں، موجوں کی شوریدہ سامانی قریب سے اچھی معلوم ہوتی ہے۔"

چندن کھڑی ہونے لگی۔ مگر عین اس لمحہ دُور کسی گوشے سے ایک وحشتناک آواز سُن کر وہ رک گئی۔ تاڑ کے کسی اجاڑ جھنڈ سے ایک شبخواں پرندہ چیختا، چلاتا، بار بار اس

ڈوبتے ہوئے ناریل کو مڑ مڑ کر دیکھتا جا رہا تھا۔

(۲)

سوشیل کو اندر سے بڑی محبت تھی۔ وہ اس کا عزیز ترین دوست تھا۔ دونوں نے بچپن کے کھیل ایک ساتھ کھیلے اور لڑکپن کی شرارتیں اکٹھی کی تھیں۔ کالج میں بھی باوجود مختلف مضامین ہونے کے وہ ایک دوسرے سے علیحدہ نہیں ہوئے۔ المختصر دونوں ایک دوسرے کے سچّے ہمدرد اور شریک راز تھے۔ ایک کے دل پر جو کچھ گذرتی دوسرے کو اس کا احساس ہوتا۔ رنج میں رنج، خوشی میں خوشی، گویا دلی تعلق نے انہیں آپس میں بے حد قریب کر دیا تھا۔ جب تک وہ زیر تعلیم اور کشمکش حیات سے آزاد رہے، اس وقت تک انہیں کبھی کوئی خاص فکر دامنگیر نہیں ہوا۔ ہمیشہ خوش باش اور بڑی بڑی باتوں کو ہنس کر ٹالتے رہے، مگر غم روزگار تو ہنس کر نہیں ٹالا جاتا! غیرتمند شخص کے لئے، خواہ وہ وراثتاً کتنا ہی دولت مند ہو، کمائی کا مسئلہ اور بھی مشکل ہے۔ وہ جب تک خود اپنی محنت سے روپیہ پیدا نہ کرے، اُسے سچّا آرام نہیں ملتا۔ اور فطرت کے اسی تقاضے نے دونوں دوستوں کو عیش و عشرت کے گہوارے سے نکال کر ایک دوسرے سے جدا کر دیا تھا۔

سوشیل بمبئی میں ملازم تھا اور اندر کلکتہ میں، کس قدر طویل فاصلہ ہے یہ! مشرق و مغرب کی مسافت کتنی گراں معلوم ہوتی ہے! اسی لئے ان دونوں کو ملے ہوئے تین سال ہو گئے ——— اور اب وہ آ رہا ہے! اندر! وہی سوشیل کا پیارا دوست! جس سے ملنے کے لئے وہ بارہا تڑپا کیا۔ خصوصاً شادی کے موقع پر اس کی یاد کی کوئی انتہا نہیں تھی مگر وہ نہ آ سکا۔ ملازمت کی پابندیاں جو ہوئیں! آخر انسان کی آزادیاں اسی قربان گاہ پر تو بھینٹ چڑھتی ہیں! ہاں، تو وہ شام کو آ جائے گا۔ سوشیل کی خوشی کا کوئی اندازہ نہیں۔ وہ مسرت سے دیوانہ ہوا جا رہا ہے، گویا سرچشمہ شارق سے سیم و زر کی

ایک شفاف وچمکدار کرن پھوٹی ہے۔ لیکن ...... لیکن اس شادمانی میں ایک سرخ لکیر بھی تو نظر آتی ہے۔ اندرا ایک سراپا راز بن گیا ہے۔ اس کے آخری خط سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ دنیا اور دنیا والوں سے بیزار ہے۔ اسے کائنات کی کسی شے پر اعتماد نہیں رہا۔ اسکے نزدیک ہر چیز بے اعتبار اور پُر فریب ہے۔ اس نے نوکری بھی چھوڑ دی ہے۔ اور ایک جگہ سے دوسری جگہ، بس سفر کئے جاتا ہے۔ شاید اس کی کوئی عزیز ترین چیز کھو گئی ہے۔ اسے اسی کی تلاش ہے اور اسی حالتِ جنوں میں وہ ایک بھٹکی ہوئی روح کی طرح سوشیل کے پاس آرہا تھا۔ مگر یہ سوشیل پر بھی پابندی کیوں؟ اس نے یہ کیوں لکھا ہے کہ "جب تک میں تمہارے پاس رہوں (اور اس کا کوئی یقین نہیں کہ کب تک؟) تم مجھ سے کوئی سوال مت کرنا۔ کبھی کچھ نہ پوچھنا۔ میں جانتا ہوں کہ تمہیں مجھ سے جو محبت ہے اس کی بنا پر تم مجھے مفید مشورہ دو گے۔ صحیح راہ دکھانے کی کوشش کرو گے لیکن نہیں، مجھے کچھ نہیں چاہیے۔ تمہیں کسی قسم کی خیال آرائی تک کی اجازت نہیں۔"

—— اور چندن حیران ہے کہ یہ اندر، سوشیل کا کیسا دوست ہے جو اتنی شرائط اور پابندیاں لگا کر آرہا ہے! پھر بھی سوشیل بے حد مسرور ہے۔ خوشی سے پھولا نہیں سماتا۔ وہ یہ تک بھول گیا ہے کہ اندر نے اسے بہت سے پرہیز بتاتے ہیں جنہیں اسے توڑنے کی سخت ممانعت ہے۔ وہ اس وقت صرف اسی کے آنے کی خبر دینے دفتر سے آیا تھا اور سارا خط تفصیل سے سنا کر پھر واپس چلا گیا ہے۔ شام کو پانچ بجے وہ اسے اسٹیشن لینے جائیگا۔ پھر دونوں دوست اکٹھے گھر آئیں گے۔

چندن، اندر کو دیکھ کر ششدر رہ گئی۔ لمبا تڑنگا نوجوان، گٹھا ہوا جسم، گندمی رنگ، ابھرے ہوئے خدوخال، گویا حسن وجوانی کا دیوتا —— مگر نہیں، اسے اس چیز نے متعجب نہیں کیا کیونکہ اس کی آنکھیں منظرِ حسن وجوانی کی پہلے سے عادی تھیں۔ سوشیل

اندر سے کم خوبرو نہیں تھا۔ ہاں جس بات سے وہ حیرت میں رہ گئی وہ اندر کی شکل و شباہت اور بات چیت کا قرینہ تھا۔ اس کی گفتگو میں بے ترتیبی اور خیالات میں اُلجھن تھی۔ اسکے بدوضع کپڑوں سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ اُن کی طرف سے قطعی بے پرواہ ہے۔ اُس کے سر کے بال بُری طرح بڑھے ہوئے تھے اور شیو بھی اُس نے کئی روز سے نہیں کیا تھا۔

پھر بھی چندن نے ایک نظر میں دیکھ لیا کہ یہ شخص اگرچہ مخبوط الحواس معلوم ہوتا ہے مگر زود حس، اور شدید احساسات کا مالک ہے۔ اس کی صحت بیشک تباہ ہو چکی ہے لیکن اُس کے نقوش کہہ رہے ہیں کہ ہم تنومندی کے نقیب ہیں، اور ڈاڑھی کے اِن بڑھے ہوئے بالوں کے پس پردہ ایک خوبصورت چہرہ ہے جس کی رونق کسی خاص وجہ سے زائل ہو گئی ہے۔ اور اس کی آنکھیں!______ آنکھوں کا خیال آتے ہی وہ ٹھٹک گئی۔ اور ایک بار پھر اُس نے اُس کی آنکھوں کو دیکھا اور اُن کی ویرانی اس کے دل پر گھر کر گئی۔ اُسے ایک تیر سا لگا اور وہ زیادہ دیر انہیں نہ دیکھ سکی۔ اُسکے دماغ میں خیالات کا سیلاب اُمنڈ آیا۔ آہ! یہ آنکھیں کیسی اُجاڑ ہیں، گویا کسی ناکام محبت کا شکستہ مزار، جسکے سرہانے ایک مدھم سا چراغ نہیں!

غرض اُس کی آنکھوں نے چندن پر بڑا اثر کیا۔ اس لیئے اور بھی کہ جب اُس نے پہلے پہل اندر کی ویران آنکھوں کو دیکھا فوراً اُس کے سامنے سوشیل کی خوبصورت آنکھیں آ گئیں اور اُس کے تمام خیالات و احساسات اُس لمحہ کے لیئے رُک کر صرف اُس موازنے پر مجتمع ہو گئے۔ ایک طرف سوشیل کی چمکدار، شوخ اور پُر تبسم آنکھیں تھیں، اور دوسری طرف اندر کی خاموش، اُداس اور پُر حسرت نگاہیں! وہ اس زبردست تقابل کی تاب نہ لا سکی اور سوچنے لگی "اندر کی آنکھیں بھی تو حسین ہیں۔ ان کی ساخت بھی تو اُسی سانچے میں ڈھلی ہے۔ پھر ان دونوں میں اس قدر فرق کیوں ہے؟ اس کی آنکھوں میں اتنی مایوسی اور حسرت کیوں بھر گئی ہے؟ ان کی مسکراہٹیں اور شوخیاں کہاں لُٹ

گئیں ہے۔"
اُس کی حسرتناک نگاہوں کا خیال چندن کو ہر وقت ستانے لگا۔ جب بھی وہ اس سے گریز کرنے کی سعی کرتی، اُسے کوئی آواز یہ کہتی ہوئی معلوم ہوتی: "کیوں ناکام کوشش کرتی ہو؟ یہ آنکھیں تمہارے من میں بس گئی ہیں! اس سے انکار ہے؟" اور وہ چپ ہو جاتی۔ اور اُسے کبھی کبھی ایسا محسوس ہوتا کہ اُس کے چاروں طرف وہی ویران آنکھیں، وہی حسرتناک نگاہیں فضا میں تیر رہی ہیں۔ وہ اُن سے بچکر بھاگ جانا چاہتی ہے۔ لیکن وہ اُس کا پیچھا کیے جا رہی ہیں۔

ایک دن تینوں بیٹھے چائے پی رہے تھے۔ سوشیل پُرجوش اور محبت بھرے لہجہ میں باتیں کر رہا تھا۔ اندر بھی کبھی کوئی مختصر سا جواب دے دیتا اور چندن اپنے خیالات میں گم، اُس کی آنکھوں کو تک رہی تھی۔ اُس نے دیکھا کہ اُن پتلیوں میں ایک شعلہ نمودار ہوا اور آناً فاناً بجھ گیا ——— اور ساتھ ہی اُس کے دل سے صدا بلند ہوئی: "ارے یہ ستایا ہوا معلوم ہوتا ہے! کہیں اس بے چارے کا کسی نے دل تو نہیں توڑ دیا!!"

(۴)

سوشیل کی کوشش ناکام رہی۔ اندر نے اپنے دل کا بھید کسی طرح ظاہر نہیں کیا بلکہ سوشیل جب بھی زیادہ مُصر ہوا، وہ یا تو بالکل خاموش ہو جاتا یا اُسے اپنا خط یاد دلا کر کہتا: "کیا تم مجھ سے اُکتا گئے ہو؟ تم چاہتے ہو میں چلا جاؤں؟" اور پھر اس کی آواز رقت انگیز ہو جاتی۔ "سوشیل! سچ جانو میں مجبور ہوں۔ میں نے بارہا چاہا کہ تمہیں سب کچھ بتا دوں مگر میری زبان بند ہو جاتی ہے۔ اس لیے تم مجھے میری حالت پر چھوڑ دو۔"

سوشیل کو اس بات کا بڑا رنج تھا کہ وہ اندر کے کام نہ آ سکا۔ حالانکہ اس کی حالت ایسی ہے جیسے آدھی رات کو قبرستان میں کوئی سایہ متحرک ہو، لیکن سوشیل اس کا

اتنا گہرا دوست ہوتے ہوئے اس کو زندوں کی بستی میں نہیں ۔۔۔ سکتا ۔

وہ دفتر کے اوقات کے علاوہ زیادہ تر آندر کے ساتھ رہتا بلکہ اس کا دل بہلانے کے لئے دونوں میاں بیوی اکثر اُسے مختلف تفریح گاہوں میں لے جاتے تھے ۔ کبھی چاندنی رات میں جوہو کے کنارے ، جہاں سمندر اور ساحلِ سمندر کے پُرکیف نظارے اور زندہ دل دولتمند مردوں اور عورتوں کی خوش فعلیاں حد درجہ دلچسپی کا سامان مہیا کرتی ہیں ۔ کبھی چوپاٹی کے کھُلے میدان میں ، جہاں اوسط اور غریب طبقے کے لوگ اپنے جذبۂ سیر یا زبان کے چٹخارے کا اظہار کرتے ہیں ۔ کبھی "باغ معلق" کے سرسبز اور انوکھے قطعات میں جہاں کی روشیں اور باغبانوں کی مصوّرانہ چابک دستیاں بے ساختہ داد کی طالب ہوتی ہیں ۔ اور کبھی گیٹ آف انڈیا جہاں متلاطم موجوں پر سفینے اپنی بہار دکھاتے ہیں ۔ آندر اپنے میزبانوں کی مدارات کی خاطر ان سب تفریحوں میں حصّہ لیتا تھا ۔ لیکن سوشیل اور چندن سمجھ رہے تھے کہ درحقیقت قدرت کی یہ سب رنگینیاں اُس کا دل نہیں لُبھا سکتیں ۔

——— اور چندن کو یہ کریدنی لگی ہوئی تھی کہ وہ کسی نہ کسی طرح آندر کے دل کا راز پالے ۔ آندر جتنا بھی اپنی دلی کیفیات سوشیل سے چھپاتا چندن کا ارادہ اور بھی مستحکم ہو جاتا کہ وہ اُس کے گریز سے کبھی ہار نہیں ماننے گی ۔ آخر چند روز کے بعد اُسے اپنی کوشش میں کامیابی کی جھلک نظر آنے لگی ۔

جب تک سوشیل دفتر میں رہتا ، چندن کو آندر کے ساتھ وقت گذارنے کے زیادہ مواقع ملتے اور وہ محض اپنے دل کی خلش مٹانے کے لئے اس امر کی کوشاں ہوتی کہ وہ بے تکلف ہو جائے اور اُس سے کھُل کر بات کرے ۔ چنانچہ کبھی کبھی وہ اُسے ساحلِ سمندر پر لیجاتی جو اُن کے گھر کے بالکل قریب تھا اور وہاں کسی طویل قامت دیودار کے سائے میں دونوں بہت دیر تک بیٹھے رہتے ۔ وہ اُسے اپنی اور سوشیل کی زندگی کے مختلف واقعات سناتی

اور مُصر ہوتی کہ اندر اس پر تبصرہ کرے۔

آخر آہستہ آہستہ ان دونوں میں مغائرت ختم ہو گئی تو اندر کو محسوس ہونے لگا کہ اُس کا خمار اُتر چکا ہے۔ اور وہ اب چند کروٹیں اور لیکر نیند سے بیدار ہو جائے گا۔ ایک دن جب چندن نے دیکھا کہ اندر موج میں ہے اور وہ آزادانہ گفتگو کر رہا ہے تو اُس نے پھر اُس سے اس عجیب و غریب ہئیت اور حد سے زیادہ خاموشی کا سبب پوچھا ـــــــ سامنے سے ایک جواں سال اور خوش منظر جوڑا ہنس ہنس کر باتیں کرتا ہوا جا رہا تھا ـــــ ـــــ چندن کا سوال سُن کر اندر کو ایسا محسوس ہوا کہ برسوں کا بند، پانی کے تھپیڑوں کی تاب نہ لا کر ٹوٹ گیا ہے، اور وہ اپنے غم و اندوہ کو مزید ضبط نہیں کر سکتا۔ چنانچہ اُس نے آہستہ آہستہ رنجیدہ آواز میں سب کچھ سُنا دیا۔ اُس نے اُسے مختصر الفاظ میں بتایا کہ اُسے ایک خوبصورت دوشیزہ سے محبت تھی اور یہ محبت رفتہ رفتہ اتنی پروان چڑھی کہ وہ چند لمحات کی جُدائی بھی برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ لیکن بعد میں معلوم ہوا کہ یہ تو اُس کی غلط فہمی تھی۔ کملاوتی نے اُس کی محبت کا جواب سچ مچ محبت سے کبھی نہیں دیا۔ وہ صرف اُسکے جذبات سے کھیلتی رہی اور جب اندر کا جذبۂ عشق منتہا کو پہنچا تو اُس نے یکایک بے مہری اختیار کر لی، گویا کملاوتی کو بس اِسی کا شوق تھا اور وہ اس طرح اُس کا دل توڑ کر بے حد خوش تھی۔ حالانکہ اندر کے یہ سان و گمان میں بھی نہیں تھا کہ وہ مایوس محبت بھی ہو سکتا ہے، اور اُس کے حُسن و عشق کی دُنیا اُجڑ کر یوں سراب ثابت ہو سکتی ہے۔ پھر جب کملاوتی کی شادی ہوئی تو اُس کے قلزمِ عشق میں طوفان بپا ہو گیا اور دُنیا کی ہر شے سے اُس کی طبیعت بیزار ہو گئی ....

چندن گُم سُم بنی سُن رہی تھی اور جب تک وہ اپنا افسانۂ محبت کہتا رہا اُن دونوں کی نگاہیں ایک دوسرے پر جمی رہیں۔

٭٭٭

اندر بستر پر لیٹا ہوا بساطِ فلک پر ستاروں کے کھیل دیکھ رہا تھا اور سوچ رہا تھا کہ اِن ستاروں کی تابانی تو عرصہ ہوا مٹ گئی تھی، پھر آج یہ کیوں چمک رہے ہیں؟ اِنکی رفتار اور چال میں بھی وہی پہلی سی تیزی اور بانکپن آگیا ہے گویا اُن کے نورِ حیات کو کسی نے پھر سے درخشانی بخشی ہے..... اور سوچتے سوچتے اس کا خیال آسمان سے زمین اور زمین سے خود اپنے آپ پر آکر رُکا، جہاں اُس کے نزدیک تمام کائنات سمٹ آئی تھی۔ وہ حیران رہ گیا، آج اُس کی زبان کیسے کھُلی؟ اُس نے اپنا رازِ دلی کیوں ظاہر کر دیا؟ اور ہر چند کہ وہ اپنے آپ کو دھوکا دینے کے لئے غلط تاویلیں تراشتا رہا لیکن وہ محسوس کر رہا تھا کہ کرّۂ ارض پر وہ بھی ایک ستارہ ہے ـــــ چندن کی مانند ـــــ اور اس کی مٹی ہوئی تابانی از سرِ نو عود کر رہی ہے، اور کوئی دوسرا ستارہ اُس کے نورِ حیات کو درخشانی بخش رہا ہے۔

چندن کو بھی نیند نہیں آئی، اُسے اس بات کا بڑا ملال تھا کہ اندر کی زندگی اُسی کی صنف کے ایک فرد نے تباہ کی ہے۔ اسی لئے بار بار اُس کو اندر کا خیال آتا رہا۔ اُسے اُس سے بیحد ہمدردی تھی بلکہ وہ یہ تک سوچنے لگی کہ کیا اس کا مداوا نہیں ہو سکتا؟ کیا وہ اس زبردست نقصان کی تلافی نہیں کر سکتی جو اندر کو ایک عورت کے ہاتھوں پہونچا ہے؟ شاید عورت ہونے کی حیثیت سے اس کا فرض ہے کہ وہ اندر کو اس تباہ حالی سے بچائے، اندر کی کشتیِ حیات ایک مستور چٹان سے ٹکرا کر برباد ہو گئی ہے۔ اُسے چاہیئے کہ وہ اُس مصیبت میں اس کا ساتھ دے، اُسے سہارا دے اور اُس کا ہاتھ تھام کر ساحل تک پہنچا دے۔ پھر خود ہی اُس نے اپنے دل سے سوال کیا "کیا میں اس کی مدد کر سکتی ہوں؟ کیا وہ میری مدد قبول کر لیگا؟"

آخر وہ اُس کی مدد پر آمادہ ہو گئی اور اُس نے ارادہ کر لیا کہ وہ اس کی حالت سنوارنے کی پوری کوشش کریگی۔ اُس کی دُنیا سے بیزاری دُور کر دیگی اور اُسے زندگی اور متعلقاتِ

زندگی میں دلچسپی لینے کی ترغیب دلاتے گی۔

(۴)

لیکن نہیں، دریا میں طغیانی آگئی اور دھارے کا پانی مصنوعی نہر میں رواں ہونے کی بجائے قدرتی نشیب کی طرف بہہ نکلا۔ چندن کا خیال غلط تھا کہ اُسے آندر سے صرف ہمدردی ہے اور وہ اُسکی حالت بہتر بنانے میں محض انسانی فرض ادا کر رہی ہو، در اصل وہ اسکی مدد کرتے کرتے خود اس کا سہارا ڈھونڈنے لگی تھی۔

—— بالآخر اُن دونوں نے محسوس کر لیا کہ وہ یکایک نامناسب اور پُر خطر راہ پر گامزن ہو گئے ہیں اور جب نفس تحت الشعور بالائے شعور آیا تو چندن نے بہتیرا چاہا کہ وہ اس راہ کو فوراً چھوڑ دے، یہیں سے واپس لوٹ جائے مگر اب یہ ممکن نہیں تھا۔ اُس کا آگے بڑھتا ہوا ہر قدم اُسے منزل کے قریب لیجاتا ہوا معلوم ہو رہا تھا اور اس کا بیقرار دل آندر کا ساتھ چھوڑنے پر کسی طرح راضی نہ ہوتا تھا۔ پھر بھی وہ گھنٹوں اپنی تمناؤں سے بر سرِ پیکار رہی اور ہر بار اسی نتیجہ پر پہونچی کہ آندر پر فتح پا کر وہ خود اپنے آپ کو ہار چکی ہو۔

آندر کو بمبئی سے وحشت ہونے لگی۔ وہ جلد از جلد چندن کو ہمراہ لیکر وہاں سے روانہ ہو جانا چاہتا تھا۔ مایوسی کی طرح اُس کی محبت میں بھی حد درجہ شدت تھی اور وہ اس میں اس قدر خود فراموش ہو گیا تھا کہ اُسے سوشیل کا مطلق خیال نہ رہا۔ اُس کے فردوسِ تخیل میں سوائے اپنے اور چندن کے کسی کے لئے گنجائش نہیں تھی۔ وہ یکسر بھول گیا کہ جیسے کملاوتی کی جدائی سے اُس کی زندگی تباہ ہو گئی تھی، چندن کے چلے جانے سے سوشیل پر بھی تباہ کن اثر ہو سکتا ہے۔ اور پھر اُس کے لئے یہ کیا کچھ کم باعثِ اذیت ہو گا کہ اُس کی متاعِ حیات خود اُس کے عزیز تریں دوست کی بدولت لٹی، جسے اُس نے اپنا، بالکل اپنا سمجھکر اپنے دامن میں پناہ دی۔

سوشیل چھ بجے کے قریب دفتر سے آتا تھا، مگر آندر بغیر اس سے ملے چار ہی بجے

اسٹیشن چلا گیا۔ چندن اُسے جاتے ہوئے دیکھتی رہی۔ "کس قدر وجیہ اور سجیلا نوجوان ہے" وہ آپ ہی آپ کہتی رہی۔ "اس خوش وضع لباس میں یہ کس قدر بھلا معلوم ہوتا ہے"! اور جب وہ سڑک کے موڑ پر نظر سے اوجھل ہو گیا تو اُسکے تمام جسم میں بجلیاں سی دوڑ گئیں اور اس کا دل بلّیوں اُچھلنے لگا۔

اُس نے آندر کے ساتھ جانا مناسب نہیں سمجھا۔ وہ یہ نہیں چاہتی تھی کہ اُسکے پرانے ملازم اور خادمہ کو کسی قسم کا شبہ ہو، چنانچہ اُس نے آندر سے طے کیا تھا کہ وہ اُسکے جانیکے تھوڑی دیر بعد روانہ ہو گی اور اُسے اسٹیشن پر مل جائیگی۔ ٹن کی آواز سن کر اُس نے سامنے دیوار پر دیکھا کہ گھڑی کی سوئیاں تیزی سے آگے بڑھتی جا رہی ہیں۔

وہ سوشیل کے نام الوداعی خط لکھنے بیٹھ گئی، جس میں اُس نے رک رک کر اپنے ارادے کو بیان کر دیا اور نہایت عجز سے اُس سے التجا کی کہ وہ اُسے معاف کر دے اور اُسے بھول جائے..... اُس نے لفافہ بند کر دیا اور چلنے کی تیاریاں کرنے لگی۔ تیار ہو کر دمِ رخصت اُس نے سارے گھر پر آخری نگاہ ڈالی اور انجام کار خط رکھنے کیلئے وہ اپنے شوہر کے کمرے میں داخل ہوئی مگر ــــ مگر آرام کرسی پر سوشیل کو بیٹھا ہوا دیکھکر اُسے سناٹا آ گیا۔ اُسکے قدم جہاں تھے وہیں جم گئے اور وہ ٹکٹکی باندھ کر اپنے شوہر کی نگاہوں کو دیکھنے لگی...... یہ اِن آنکھوں کو کیا ہو گیا؟ یہ بربادی کا فسانہ کیوں کہہ رہی ہیں؟ انکی تازگی اور چمک کب مٹ گئی؟ اور.... معاً اُس کے تخیّل میں اُن دونوں کی آنکھیں آگئیں ــــ آندر کی شاداب، متبسّم اور تابناک، اور سوشیل کی فسُردہ خاموش اور غمناک!!

(۱۹۴۲ء)

جوانی ناچ رہی تھی

مریم اس کے اُفقِ شباب پر اُن دنوں نمودار ہوئی جب وہ بسلسلۂ ملازمت بمبئی میں مقیم تھا۔ وہی بمبئی جسے "ملوں کا شہر" اور "شہروں کی دلہن" کہا جاتا ہے، آوارگی کا مرکز اور عشرت گاہوں کی راجدھانی نہیں۔ جس کی عالیشان عمارتوں اور مشہورِ عالم سیرگاہوں کو سب جانتے ہیں لیکن اُس کی اُن غلیظ اور مضرِ صحت چالوں کو کوئی سیاح نہیں جانتا جہاں کارخانوں اور گوداموں میں کام کرنے والے انتہائی مفلسی اور بے بسی سے زندگی بسر کرتے ہیں۔ اور جہاں ہر روز طلوع ہونے والا آفتاب تاجروں اور سٹے بازوں کی دولت، اور بیکاروں اور محدود آمدنی والوں کی مجبوریوں میں باقاعدہ اضافہ کئے جاتا ہے۔ لوگ کہتے ہیں کہ دہاں حسن و جوانی کی کثرت ہے لیکن یہ کوئی نہیں کہتا کہ جمال و شباب۔ کے ان نظر فریب گل بوٹوں کے پسِ پردہ، لوحِ حیات پر کریہہ اور گھناؤنے نقوش کندہ ہیں ..... خیر، جانے دیجئے، افسانہ نگار پھر مریم کی کہانی شروع کرتا ہے۔

۱

مریم، جس کا یہ فسانہ ہے، سولومن سائیلس کی چھوٹی بیٹی تھی۔ اس کے یہودی باپ کی بوسیدہ کوٹھی اُس عمارت سے، جس کی ایک فلیٹ میں گلریز رہا

کرتا تھا، تھوڑے فاصلے پر، عام راستے سے ذرا ہٹی ہوئی تھی۔ یہ لالچی یہودی اپنے وسیع کنبے اور اپنی بڑی لڑکی کی وجہ سے سارے سنتا کروز میں معروف تھا۔ بڑی لڑکی کا نام تھا روزی جس نے اپنی سرشار جوانی اور نمائشِ حسن کے سبب تمام آبادی میں شہرتِ خاص حاصل کر لی تھی۔ اس کا زیریں لباس بالعموم نصف رانوں تک آکر ختم ہو جاتا تھا اور بالائی لباس میں سے اس کے چھلکتے ہوئے سرچشمہائے شباب اور برہنہ بازو تقویٰ شکنی کے لئے، مردوں کو گویا للکار کے اپنی طرف متوجہ کرتے تھے۔ اس کا چہرہ بہت خوبصورت نہیں تھا مگر اُس کی نیلی نشیلی آنکھوں اور انار کی مانند سُرخ رسیلے لبوں میں وہ مست کر دینے والی شوخیاں رقصاں تھیں جو جذبات کو آنِ واحد میں بیدار کر دیتی ہیں۔ اُس کی عریاں رانیں جن میں خون کی گردش کے ساتھ ساتھ اُس کا بے پناہ شباب دورہ کرتا تھا، آوارگی اور دادِ عیش دینے کی مجسم دعوت تھیں —— اور گلریز جانتا تھا کہ بمبئی کی سینکڑوں اینگلو انڈین اور دیسی لڑکیوں کی طرح یہ بھی اپنا اور اپنے بے شمار متعلقین کا پیٹ اپنے حسن و جوانی کے ذریعہ پالتی ہے۔ یہی تو یہاں کی رِیت ہے! ماں باپ نے پال پوس کر جوان کر دیا، یعنی جوانی کی دولت اور اس تجارت سے فائدہ اُٹھانے کا راز سمجھا دیا، اب باقی زندگی گذارنی اور والدین نے جو سرمایہ بچپن میں لگایا تھا اُس کا گویا منافع دینا اُن کا فرض ہے۔ سرمایہ! تجارت! منافع!! یہی بمبئی کی کامیاب زندگی کا سب سے بڑا گُر ہے۔ ہندوستان کی یہ سب سے بڑی تجارت گاہ اور کاروبار کی بڑی بھاری منڈی جو ٹھیری!! لیکن گلریز، روزی سے ڈرتا تھا۔ اُس کی کبھی اتنی ہمت ہی نہیں ہوتی تھی کہ روزی کے ساتھ، کورٹ شپ کے نام سے، دوستی پیدا کرے، یعنی سودا ہونے سے پہلے تاجرانہ فنکاریاں دکھلا سکے۔

شام کو وہ اُس کی ہمراہی میں نئے نئے آمیوں کو دیکھتا تھا جن میں سے اکثر

اُس سے کم وجیہہ اور کم آسودہ ہوتے لیکن اُس کا کسی طرح حوصلہ نہ پڑتا اور وہ اپنے اُوپر جبر کر کے رہ جاتا۔ کبھی بار اُس نے سوچا کہ روزی کے حیاسوز سراپے نے اُسکی رگوں میں بھڑکتے ہوئے شعلوں کی طرح جو بے چینی پیدا کر دی ہے اُس کی تسکین کے لئے وہ بازاری عشرت گاہوں میں شب باشی اختیار کرلے، مگر نہیں۔ بازار حُسن جانے سے اُس کے پاؤں لڑکھڑانے لگتے تھے اور شریف زادیوں کے چہرے لگانے والی خانگیوں سے ربط ضبط قائم کرنے کی اس میں اہلیت نہیں تھی۔ یہ نتیجہ تھا اُس ماحول کا جس نے اس کی پرورش کی اور جس میں ممانعت اور ڈر تانے بانے کی مانند سموئے ہوئے تھے۔ چنانچہ روزی کی بارعب شخصیت کے علاوہ اُسے اس نصیحت کا بھی بڑا خوف تھا کہ حُسنِ سرِراہ شرمناک امراض اور عذابِ مسلسل کا منبع ہے۔

سالومن کے خاندان میں چھوٹے بڑے، بالغ اور نابالغ بچوں کی بڑی کھچر دھان تھی اور یہ بچے کھیلتے کھیلتے یا ضرورتاً اکثر اس طرف آ نکلتے تھے جہاں گلریز کا فلیٹ تھا۔ ان بچوں کے پھٹے پرانے کپڑوں اور اُن کے بار بار گھٹیا ہوٹلوں اور دوسری دکانوں سے کھانے پینے وغیرہ کی چیزیں خریدنے سے اُن کی مفلوک الحالی ظاہر ہوتی تھی۔ اور ان بچوں میں وہ مریم بھی تھی جس کا کام عموماً ڈبل روٹی خریدنا اور لانڈری سے فراک اور اسکرٹ لانا لے جانا تھا۔ اس کی عمر پندرہ سولہ سال ہوگی لیکن چال ڈھال اور طور طریق سے وہ ابھی کمسن معلوم ہوتی تھی۔ اس کی سادہ لوحی کا یہ عالم تھا کہ وہ بازار میں اس بے پروائی اور بے فکری سے چلتی پھرتی تھی جیسے وہ اپنی ہی کوٹھی کے احاطے میں چہل قدمی کر رہی ہو۔ ویسے بھی روزی اور اس میں بڑا فرق تھا۔ اس کا جسم اور لباس روزی کی طرح جذبات کو جگانے والے نہیں تھے البتہ وہ خوبصورت اُس سے کہیں زیادہ تھی۔ اُس کے تراشے ہوئے سُنہری مائل بال جن

میں آڑی مانگ نکلی ہوتی اور اس کے اینگلو انڈین چہرے کے نقوش جن پر عموماً مسکراہٹ کھیلتی ہوتی، خاص طور پر جاذبِ نظر تھے۔ ہر چند کہ اس کی بھی اُجلی اُجلی باہیں اور گلابی گلابی پنڈلیاں برہنہ ہوتیں مگر وہ کچھ اس طرح بدن چرا کر چلتی تھی کہ جن لوگوں نے روزی کی چنچل اور مست جوانی سے اثر لیا تھا وہ اس کی طرف کم توجہ کرتے تھے۔ البتہ گلریز اُس کو بڑے غور سے دیکھتا۔ اور جب تک وہ راہ چلتے اُسے نظر آتی رہتی وہ اپنی بالکنی میں کھڑا اُسے نیم وا آنکھوں سے تکے جاتا تھا۔

اس کشش کی ایک وجہ اور بھی تھی۔ وہ یہ کہ روزی عمر اور قد و قامت میں گلریز سے نکلتی ہوئی تھی جس کی بنا پر اس کا حوصلہ اور بھی پست ہو گیا تھا لیکن مریم اپنی کم عمری اور نازک اُٹھان کی وجہ سے اُسے بیحد پسند تھی۔ سب سے بڑی بات یہ تھی کہ اسکی طرف سے اس کو کوئی خطرہ نہیں تھا کیونکہ سالومن اس کو ابھی دوشیزہ رکھنا چاہتا تھا۔ شاید اس لیے کہ ابھی سرمایہ لگانے کے دن تھے اور اس کی تمنا تھی کہ پہلے یہ فصل خوب پھلے پھولے تاکہ زیادہ سے زیادہ آمدنی ہو سکے۔ بہرحال رفتہ رفتہ اسکے جذبات کی رَو، روزی کے بجائے مریم کی جانب تبدیل ہو گئی اور اسکی پُر اشتیاق نظریں فرصت کے اوقات میں مریم کے بھولے اور مسکراتے ہوئے چہرے سے کھیلنے لگیں۔

ایک دفعہ شام ہوتے مریم اپنی دائیں باہیں پر اودا فراک ڈالے لانڈری جا رہی تھی۔ سڑک کے موڑ پر سوائے سولومن کے بچوں کے جو کھیلتے ہوئے پھر رہے تھے، وہاں کوئی اور نہیں تھا۔ آمد و رفت رکی ہوئی تھی اور دکاندار اپنے کاموں میں مشغول تھے۔ مریم کو یوں آتے دیکھکر گلریز کی طبیعت لہرا گئی اور جب اُس نے اس کی جانب بلا کسی قصد، یونہی، ذرا نگاہ اُٹھائی تو گلریز نے یکایک ہمت کر کے اپنی بائیں آنکھ ہولے سے مچکا دی ــــــ ایک لمحے کے لئے مریم نے اُسے

نظر ٹھہرا کر دیکھا اور گلریز کی جان نکل گئی۔ اُس نے کہیں سُنا تھا کہ عورت کو اپنی طرف منعطف کرنے کا یہ پہلا طریقہ ہے اور اگر وہ مسکرا دے تو گویا وہ دعوتِ عشق پر راضی ہے مگر اب جو مریم نے خاموشی سے اُسے تکا تو وہ گھبرا سا گیا اور سمجھا کہ یہ بُرا مان گئی ہے۔ ضرور کوئی آفت آئے گی۔ لیکن مریم کچھ نہیں سمجھی۔ جیسے وہ مصنوعی بناؤ سنگھار سے پاک تھی اسی طرح اس کا مزاج اور علم بھی سادہ تھا۔ گلریز کی چشم زنی نے اُس کے صرف استعجاب میں اضافہ کر دیا جس سے وہ اکثر اس کو بالکنی میں کھڑا اپنی طرف متوجہ دیکھا کرتی تھی۔ اُس نے بس اتنا سوچا کہ یہ شخص مجھے کیوں گھور کر دیکھا کرتا ہے۔ اور آج ــ ــ آج یہ آنکھ کا اشارہ کیسا؟ اور دوسرے لمحے، از خود، وہ مسکراتی ہوئی شانِ بے نیازی سے چلدی۔

دوسرے دن صبح، دفتر جاتے ہوئے اُس سے نانبائی کی دُکان پر ملا۔ گذشتہ شام کو اُس کے مسکرا دینے سے اُسے میں ذرا حوصلہ پیدا ہو گیا تھا۔ چنانچہ اُس نے پھر ہمت کی اور قریب سے گذرتے ہوئے، گویا اخلاقاً آہستگی سے کہا۔ "گڈ مورننگ"۔

وہ حسبِ عادت مسکرائی اور جواباً بولی۔ "گڈ مورننگ!" اور گلریز مطمئن و مسرور، خوش کی ایک شبابی نظم گنگناتا ہوا آگے چلدیا۔

۲

اس طرح اُن دونوں میں راہ و رسم پیدا ہو گئی۔ چنانچہ دفتر جانے سے پہلے اور دفتر سے واپس آنے کے بعد وہ پہروں اپنے فلیٹ میں سے اس کے انتظار میں سڑک کے موڑ کو دیکھتا رہتا۔ کبھی وہ نظر آجاتی تو گلریز جلدی سے نیچے اُتر آتا اور کسی نہ کسی بہانے سے اُس سے ایک آدھ بات کر لیتا تھا۔ چند روز یونہی سر راہے گاہے ملاقاتیں ہوتی رہیں اور وہ ایک دوسرے سے قریب تر ہوتے گئے۔ گلریز خوش پوش نوجوان تھا مگر جب سے اُن میں گفتگو ہونے لگی تھی وہ خاص طور پر

خیال رکھتا تھا کہ اس کا لباس عمدہ سے عمدہ ہو۔ مزید براں چونکہ اُسے مریم کے گھرانے کی تنگدستی کا اچھی طرح علم تھا اس لئے وہ موقع محل دیکھکر اپنے آپ کو روپے پیسے کی طرف سے بے فکری بھی ظاہر کرنے کی کوشش کیا کرتا تھا۔ لہذا مریم اُسے کئی بار فقیروں کو اکنیاں اور چونیاں پھینکتے ہوئے دیکھ چکی تھی، اور اب جو تھوڑے دنوں سے وہ اس سے نہایت تپاک سے پیش آتا تھا تو اس نے یہ رائے قائم کی کہ یہ خوبرو نوجوان نہایت مخلص اور دولتمند ہے۔

پھر جب اُن دونوں کی واقفیت خوب گہری ہو گئی تو شام کے جھٹپٹوں میں وہ اکثر کئی کئی منزلوں والی عمارتوں کی چھت میں خاصی دیر تک باتیں کرتے رہتے تھے۔ گلریز اُس کے لئے طرح طرح کی ٹافی اور انگریزی مٹھائی لاتا اور مریم اُسے شکریہ کے ساتھ قبول کر کے نہایت شوق سے کھاتی۔ اور ایک دن جب اُس نے اُسے چاء کی دعوت دی تو مریم شش و پنج میں پڑ گئی۔ اُسے یقین تھا کہ یہ دعوت نہایت پر تکلف، اور گلریز کے ساتھ اس میں شرکت باعث مسرت ہوگی، مگر اُسے اپنے باپ سے بڑا ڈر لگتا تھا، جس کی سخت تاکید تھی کہ وہ کسی شخص سے مصافحہ تک نہ کرے۔ لیکن جب گلریز نے اس دعوت کو قبول کرنے کی بہ اصرار تاکید کی اور اُسے بتایا کہ وہ اس کے لئے نہایت لذیذ بسکٹ، تازہ پھل، عمدہ کیک پیسٹری اور دیگر اشیاء خود خرید کر لائے گا تو مریم کے منہ میں پانی بھر آیا، اور وہ اپنے باپ کی سخت گیری کو بھول کر کہنے لگی "بہت اچھا۔ مگر ہفتے کو نہیں۔ اتوار کی رات کو آٹھ بجے رکھیئے۔ اُس روز پپّا، وِلے پارلے جلسے میں جائیں گے اور میں چپکے سے آپ کے ہاں آجاؤں گی۔"

گلریز کا فلیٹ نگار خانۂ چین کی مانند سجا ہوا تھا۔ دیواروں پر حسین و جمیل تصویریں

آویزاں تھیں اور ڈرائینگ روم کے سازوسامان اور اس کی آراستگی سے میزبان کی دولتمندی اور نفاست پسندی کا پتہ چلتا تھا۔ مریم واقعی چوروں کی طرح آئی، جیسے اسے ہردم یہ احتمال ہے کہ کسی نے اسے یہاں آتے ہوئے دیکھ نہ لیا ہو، اور گلریز نے یہاں تک احتیاط برتی کہ دسترخوان بچھنے کے بعد اس نے اپنے ملازم اور باورچی کو رات کا سینما دیکھنے کے لئے چھٹی دیدی تھی۔ میز پر انواع واقسام کے کھانے چنے ہوئے تھے اور جن برتنوں کو استعمال کیا گیا تھا وہ بھی بیحد خوبصورت اور نازک تھے۔ مریم نے اس سارے ماحول کو بڑے تعجب سے دیکھا اور گلریز کی فیاضی اور تکلفات سے مسحور ہو گئی۔

کھانا کھانے کے بعد وہ اس کمرے میں آ بیٹھے جو بیک وقت ڈرائنگ روم اور بیڈ روم دونوں کا کام دیتا تھا۔ مریم اس کی خاطر تواضع کی بیحد ممنون تھی، اور اس نے کئی بار اس کا اظہار کیا۔ گلریز کو اس کی تعریف سے بڑی خوشی ہوئی اور اس کا جی چاہا کہ وہ یونہی اس کی، اس کے فلیٹ کی، اس کے تکلفات اور تواضع کی، اسکے اخلاق اور ذوق کی تعریف کئے چلی جائے۔ آخر جب گھنٹے کی سُریلی ضرب نے ساڑھے آٹھ بجائے تو مریم جانے کے لئے کھڑی ہو گئی۔ وہ سوچ رہی تھی کہ ایک ہماری کوٹھی ہے، اتنی بڑی مگر بوسیدہ۔ ایک یہ فلیٹ ہے، اتنا مختصر مگر سازوسامان سے آراستہ۔ ایک ہمارا خاندان ہے، وسیع اور غریب۔ ایک گلریز ہے، اکیلا اور امیر۔ وہاں مفلسی افسردہ ہے، یہاں دولت مسکرا رہی ہے اور وہ انہی خیالات میں کھوئی ہوئی جو پیچھے ہٹی تو تپائی سے الجھ کر مسہری پر جا گری۔ اس کا اسکرٹ گھٹنوں سے اوپر سرک گیا اور اس کی گلاب کی پنکھڑیوں جیسی لال اور نرم و گداز ٹانگیں عریاں ہو گئیں ——— بجلی سی چمکی اور گلریز گویا مقناطیس کی بے پناہ قوت سے گھسٹ کر اس میں جذب ہونے کیلئے مچل گیا۔ اور اسے ایسا معلوم ہوا کہ جوانی، حسن و صحت کی تند و تیز شراب سے مخمور،

اس کی نگاہوں کے سامنے، برہنہ ہو کر مستانہ وار ناچ رہی ہے۔ اُس نے اُسے اپنی آغوش میں لے لیا اور اُس کے لبوں میں اپنے لب اس طرح پیوست کر دئے جیسے وہ اُن کیلئے صدیوں سے پیاسے تھے۔

مریم اُس کے جلتے ہوئے ہونٹوں اور آتشیں سانسوں سے بھونچکی سی رہ گئی۔ مگر اس سے پیشتر کہ وہ مدافعت کرتی، گلریز نے کچھ ایسی نغماتی سرگوشی میں محبت کا پیغام سُنایا کہ خود اس کا سازِ دل، اس جوانِ رعنا کے دل کی دھڑکن سنتے سنتے اس کا ہم آہنگ ہو گیا اور جیسے فیوز ہونے سے پہلے بجلی کے مثبت و منفی تار آپس میں ٹکرا کر یکلخت جھنجھنا اُٹھیں، چند لمحات کے لئے اُن دونوں کے عقل و حواس تھرا کر رہ گئے۔

(۳)

چند ماہ بعد، ایک دن اتوار کو دو بجے کے قریب وہ خطوط لکھنے میں مصروف تھا کہ مریم یکایک اندر آ گئی۔ وہ گھبرائی ہوئی تھی اور اُس کی نگاہوں سے توحش ظاہر ہو رہا تھا۔ گلریز اُسے یوں پریشان دیکھ کر خود بھی پریشان ہو گیا۔ آخر مریم آبدیدہ ہو کر بولی: "مسٹر گلریز، ممی کہتی ہیں، میں ماں بننے والی ہوں اور اُنہیں اُس کا اتنا رنج ہے کہ وہ یہ بھی بھول گئی ہیں کہ میری طبیعت چند روز سے خراب ہے۔"

گلریز اس غیر متوقع خبر اور سوئے ظن کے خوف سے سہم گیا اور اُسے ایسا محسوس ہوا کہ زندگی کے سب سے عجیب اور سب سے زیادہ پُر لذت تجربے نے اُس کے تخیّل میں جو ناقابلِ بیان اثرات پیدا کر دئے تھے وہ اب شرارے بن کر اُس کے بدن سے چمٹ رہے ہیں۔

مریم نے رومال سے آنکھیں پونچھتے ہوئے پھر کہا: "پپا جو بازار سے سگار خریدنے گئے ہیں، ممی اُنہی کے انتظار میں برآمدے میں ٹہل رہی ہیں۔ آہ، اب کیا ہو گا؟ خدارا مجھ

بچاؤ۔ پیا بڑے ظالم ہیں، میرے ساتھ وہ تمہیں بھی نہیں چھوڑیں گے میں تمہارے پاس پچھلے دروازے سے چھپ کر آئی ہوں۔"

وہ ناتجربہ کاری سے اپنا عجز ظاہر کرنے والا تھا کہ ایکا ایکی ایک بات اُس کی سمجھ میں آگئی اور وہ اپنے اُوپر قابو پاکر اُسے تسلی دیتے ہوئے بولا "تم بالکل نہ گھبراؤ مریم! میں تھوڑی دیر میں خود تمہارے والدین کے پاس آتا ہوں۔ میرے پاس بیحد روپیہ ہے۔ میں یہ سب اُنہیں دیدونگا اور تم سے شادی کرنے کی درخواست کرونگا ۔۔۔ تم نے بہت اچھا کیا کہ بروقت مجھے اطلاع کردی!"

۔۔۔۔ اور جب وہ مطمئن ہو کر چلی گئی تو گلرینر کچھ دیر کے لئے سوچ میں پڑ گیا وہ جانتا تھا کہ یہودی پرلے درجے کا لالچی ہے اور اس کے پاس اس دولت کا عشر عشیر بھی نہیں جس کی اُمید میں اُس نے ابھی تک مریم کو دوشیزہ رکھا تھا۔ اس مصیبت سے بچنے کی اب ایک ہی راہ تھی۔ چنانچہ اُس نے جلدی جلدی وہ تمام کاغذات اور اشیاء اکٹھی کرلیں جن سے اُسکے گھر اور نام ونشان کا پتہ چل سکتا تھا، اور چُپ چپاتے اُس سرزمین کو خیرباد کہا جہاں اُس نے حُسن کو سرِراہ اور جوانی کو شعلوں کی طرح ناچتے ہوئے دیکھا تھا۔

بیس سال بیت گئے۔ لیکن اس طویل عرصے میں بمبئی کی واردات خواب و خیال نہیں ہوئیں۔ کیونکہ سماجی اور مذہبی قوانین کے مطابق اُس نے اپنے وطن میں آکر جو شادی کی تھی وہ اس کے لئے سوہانِ روح ثابت ہوئی ۔۔۔۔ اس لئے کہ وہ اولاد سے محروم رہا، اُس اولاد سے جسے جائز کہا جاسکتا، جسے اعلانیہ اپنا کہنے سے سوسائٹی میں بدنامی نہ ہوتی اور جو خود اُس کی آغوش میں پرورش پاتی۔ شادی کے کئی سال تک جب اُسے یہ نعمت نہیں ملی تو اُسے رہ رہ کر اُس بے گناہ بچے کا

خیال آنے لگا جس میں خود اس کا خون گردش کرتا تھا مگر جس کی پیدائش مریم کے بطن سے ہوئی یعنی ایک ایسی عورت سے جس کے رشتے کی سماج گواہ نہیں تھی۔ مریم کو وہ بھول گیا تھا، لیکن اب جبکہ اُس کے بڑھاپے کی صبح ہو رہی تھی، وہ تمنّا کرتا تھا کہ اس کی بھی اولاد ہوتی! وہ بھی ایک جوان بیٹے کا باپ کہلاتا! اس کی ضعیفی کا بھی سہارا ہوتا!! لیکن اپنے گھر میں یہ سب تمنائیں لاحاصل تھیں۔ قدرت نے ازراہِ تمسخر اُسے مذہب اور سماج کی نظروں میں لاولد جورکھا تھا!! اور یہ دُکھ اُسے اُس وقت اور بھی ناقابلِ برداشت معلوم ہوتا جب وہ دیکھتا کہ اس کے کنبے میں ہر مرد اور عورت کے کئی کئی بچے ہیں۔ اتنے کہ ماں باپ اس تعداد سے نالاں ہیں مگر اُن کی گنتی بڑھے جاتی ہے۔ بس ایک یہ، اور ایک اُس کی بیوی ہے جنہیں لاولد دیکھ کر اُن کے عزیز بھی کُڑھتے ہیں۔

ایک دفعہ دونوں میاں بیوی ریل کے سفر میں اپنی بدقسمتی کا ذکر کر رہے تھے۔ گلریز کی بیوی نے ٹھنڈا سانس بھر کر کہا "اگر ہمارے ہاں اولاد ہوتی تو ہم کس قدر خوش نصیب ہوتے! ہمارے پاس دھن، دولت، عزت، سب کچھ ہے لیکن پھر بھی ہمیں وہ اطمینان اور خوشی نصیب نہیں جو غریب سے غریب بچوں والوں کو میسّر ہوتی ہے!!"

خالی الذہن گلریز کھڑکی میں سے تار کے کھمبوں کو پیچھے جاتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔ اپنی بیوی کی دلریش گفتگو سن کر بولا "اور میرے اس پھیلے ہوئے کاروبار کا بھی تو کوئی وارث نہیں ہے۔"

اتنے میں کوئی اسٹیشن آگیا اور ٹرین کچھ دیر کے لئے ٹھہر گئی۔ پھر جب وہ روانہ ہونے لگی تو اچانک کوئی چودہ پندرہ سال کا لڑکا فوجی لباس پہنے، گھبرایا ہوا اُن کے درجے میں آگیا اور لجاجت سے کہنے لگا: "ریل چل پڑی تھی۔ میں آگے اسٹیشن پر اُتر

جاؤں گا۔"

گلریز نے اُسے اُوپر سے نیچے تک دیکھا۔ خاکی وردی کے علاوہ اُس کے سر پر بڑا سا ہیٹ اور پاؤں میں بھاری بھاری بوٹ تھے۔ اس کا رنگ کالا تھا اور اسکے چہرے سے مسکینی ظاہر ہوتی تھی۔

گلریز نے اُسے بیٹھنے کا اشارہ کیا اور اُس سے باتیں کرنے لگا۔ فوجی لڑکے نے اُسے بتایا کہ میں ناگپور چھاؤنی میں ڈرم بجاتا ہوں اور اسکے ساتھ جب اُس نے اُن تکالیف کا ذکر کیا جو بطور فرائض اُسے جھیلنی پڑتی تھیں تو گلریز کو اُس سے ہمدردی پیدا ہوگئی۔ اور اُس نے ازراہِ شفقت کہا "تو تم نوکری کیوں نہیں چھوڑ دیتے؟"

فوجی لڑکے نے لاچاری کے لہجے میں جواب دیا "ہمارے ماں باپ نہیں ہیں۔ نوکری چھوڑ کر ہم کہاں جائیں گے؟ یہاں ہمیں تنخواہ کے علاوہ راشن بھی ملتا ہے!"

ــــــ اور یہ سُنکر کہ وہ والدین کے سائے سے محروم ہے، گلریز کا دل بھر آیا اور اُس کے مجروح خیالات ماضی کے آشیانے کی طرف پرواز کرنے لگے..... "اس کا بھی تو ایک بچہ ہے! اب تو وہ اُنیس بیس سال کا جوان ہوگا! مگر اس کا سر دھرا نہیں ہے! کہیں وہ بھی فوج میں بھرتی نہ ہو جائے؟!" اور یہ خیال آتے ہی وہ بے چین و بے قرار ہوگیا۔ سماج کا ڈر اور یہودی کا خوف اُس کے ذہن سے حروفِ باطل کی طرح مٹ گئے اور اس اندیشے کے پیدا ہوتے ہی وہ لرزہ براندام ہوگیا کہ کہیں اس کا بیٹا ــــ اُسی کا گوشت و پوست، جو ہمیشہ اس کی گود اور پیار سے محروم رہا میدانِ جنگ میں موت سے کھیلنے نہ چلا جائے!"

اُس سے نہ رہا گیا۔ معاً اُس نے فیصلہ کر لیا کہ بیوی کو گھر پہنچا کر وہ فوراً ابھی چلا جائے گا اور جن شرائط پر بھی مریم اور اُس کے والدین کہیں گے وہ منظور کر کے اپنے لختِ جگر کو ہمراہ لے آئے گا۔

۴

دادر سے لوکل ٹرین میں بیٹھ کر سنتا کروز اور وہاں سے سیدھا مریم کی کوٹھی پر پہونچا۔ گیارہ بج گئے تھے۔ رات کا خاموش اندھیرا ہر طرف پھیلا ہوا تھا۔ بس پہلو کے ایک کمرے میں تھوڑی سی روشنی ہو رہی تھی۔ اُس نے جھانک کر دیکھا کہ ایک ادھیڑ عمر کی عورت سینے میں مشغول ہے، اور آہستہ سے کواڑ پر دستک دی۔

عورت نے دروازہ کھول دیا اور حیرت سے پوچھا۔ "تم کون ہو؟"

جواب دینے سے پہلے وہ اندر آ کر کرسی پر بیٹھ گیا۔ اور چاروں طرف نظریں دوڑاتے ہوئے بولا۔ "میں مریم اور مسٹر سائمیلس سے ملنا چاہتا ہوں۔ وہ کہاں ہیں؟"

ادھیڑ عمر کی عورت نے اُسے بغور دیکھا اور قدرے توقف کے بعد بولی۔ "اُن دونوں کا انتقال ہو چکا ہے۔ تم کو کام کیا ہے؟"

مریم کے انتقال کی خبر سُنکر گلریز کو اس کی جُدائی کا پہلی بار احساس ہوا اور اُس نے اپنے مخاطب پر نظریں جما کر کہا۔ "مریم کا انتقال کب ہوا؟ اور اس کا بچّہ ......؟" گلریز کا حلق خشک ہو گیا اور وہ اپنا سوال پورا نہ کر سکا۔ اسکی یادداشت اس ادھیڑ عمر کی عورت پر مرکوز ہو گئی تھی اور جب اُس نے اس کو زیادہ غور سے دیکھا تو جیسے کوئی دُھندلی تصویر روشن ہو جائے۔ وہ فوراً پہچان گیا کہ یہ روزی ہے جسے وقت کی رفتار نے گھِسی ہوئی کمان کی طرح پُرانا اور عمر رسیدہ کر دیا ہے۔

روزی اُسے مشکوک نگاہوں سے دیکھ رہی تھی۔ مریم کے ساتھ اُس کے بچّے کا ذکر سنکر اسکی نیم وا آنکھیں پوری طرح کھُل گئیں اور اُس نے بے صبری سے پوچھا "تمہارا نام کیا ہے؟ —— تم یہ سب سوال کیوں کر رہے ہو؟"

اجنبی نے بے چین آواز میں جواب دیا۔ "میرا نام گلریز ہے —— مجھے بتا دو، مریم کا بچّہ کہاں ہے؟"

یکایک کمرے میں مکمل خاموشی چھاگئی اور ایسا معلوم ہوا کہ روزی کی آنکھوں سے چنگاریاں نکل رہی ہیں۔ پھر، جیسے کوئی بھوکی شیرنی بپھر جائے، وہ خشمناک لہجے میں چیخی: "تو تم ہی وہ گلریز ہو جس نے میری معصوم بہن کے نانوسِ شباب کو اپنی ہوسناکی سے پاش پاش کر دیا۔ جس کی بے داغ کیاری میں تم نے گناہ کا بیج بویا، ایسا بیج جو باوجود ہماری مخالفتوں کے مریم کی بھرپور آغوش میں پھلتا پھولتا رہا ـــــ خوب ہوا، خوب ہوا کہ تم آ گئے۔ میں نے بارہا ربّیوں سے دُعائیں کرائیں، عشائے ربانی میں منتیں مانیں کہ ایک دفعہ، صرف ایک دفعہ تم سے ملاقات ہو جائے تاکہ تمہیں بتا سکوں کہ ایک کنواری یہودن کی آہ کبھی خالی نہیں جاتی ......"

گل ریز نے اس کے غصّے کی طرف بالکل توجہ نہیں کی اور پھر پوچھا: "مریم کا بچّہ کہاں ہے؟"

روزی اور طیش میں آ گئی: "مریم کے بچّے کو کیوں پوچھتے ہو؟ یہ کیوں نہیں کہتے کہ میرا بچہ کہاں ہے؟ ـــــ تم اب اُسے نہیں دیکھ سکتے۔ وہ ـــــ"

گلریز اُس کی بات کاٹ کر بولا: "کیوں نہیں؟ کیوں نہیں دیکھ سکتا؟ ـــــ بتاؤ وہ کہاں ہے؟ کیا وہ بھی ان لوگوں کے ساتھ برابر کے کمرے میں سو رہا ہے جنکے سانسوں اور خراٹوں کی آوازیں آ رہی ہیں؟"

"نہیں۔ وہ یہاں نہیں ہے!" روزی کی آنکھوں میں چمک پیدا ہو گئی جیسے چراغ گُل ہونے کے بعد حجرے میں دوبارہ تیز روشنی ہو جائے "ـــــ گلریز! تم نے مریم کی دوشیزگی نہیں لُوٹی، ہم پر قیامت توڑ دی۔ پپّا کو جب معلوم ہوا کہ تم فرار ہو گئے ہو اور تمہارا پسماندہ سامان پانچ سات سو روپے سے زیادہ کا نہیں ہے تو غم اور غصّے سے وہ دیوانے ہو گئے اور اُن کی موت بھی پاگل خانے ہی میں ہوئی۔ مگر وہ بھولی بھالی مریم آخری دم تک یہی سمجھتی رہی کہ تم ضرور واپس آ جاؤ گے۔ اُس نے اپنے بچّے کی پرورش

بڑی مصیبتوں سے کی، اور ہم سب لوگوں کی ملامت اور خفگی کا مردانہ وار مقابلہ کرتی رہی اور یہ دیکھو ——"

گلریز گم سم بنا ہوا اُس کی باتیں سُن رہا تھا۔ روزی نے دراز کھینچکر البم نکالی اور اُسے کھولتے ہوئے بولی تب —— وہ ہر سال اپنے بچّے کی تصویر کھنچوایا کرتی تھی۔ اس البم میں اُس کی انیس تصویریں ہیں۔ یہ دیکھو —— ان تصویروں میں تمہاری کس قدر مشابہت ہے۔ انہیں اپنے گھر والوں کے پاس لے جاؤ۔ تمہاری ماں اور بہنیں یہی کہیں گی کہ یہ تمہارے ہی بچپن کی تصویریں ہیں۔"

غم دیدہ گلریز بڑے انہماک سے تصویریں دیکھ رہا تھا اور اس کے دماغ میں مختلف النوع خیالات آپس میں متصادم ہو رہے تھے۔ روزی نے پھر کہا "مریم کے جیتے جی میں کچھ نہ کر سکی مگر مجھے تمہارے بیٹے سے از حد نفرت تھی۔ میں نے تہیّہ کر لیا تھا کہ اپنی بہن کا انتقام میں ضرور لوں گی —— تمہاری اولاد سے! چنانچہ جب وہ مر گئی تو وارا طن میرے قبضے میں تھا اور وہ بیوقوف سمجھتا تھا کہ میں اُسے بیحد چاہتی ہوں۔"

گلریز گلوگیر آواز میں بولا "وہ کہاں ہے؟ مجھے بتادو وہ کہاں ہے؟ تم مجھ سے اسکی قیمت لے لو۔ اسکے عوض چاہے جتنا روپیہ طلب کر لو۔ ارے کہیں تم نے اُسے مار تو نہیں ڈالا —؟"

"نہیں" روزی کا چہرہ تمتما رہا تھا۔ اُس کے ہونٹوں پر زہر خندہ نمودار ہوا "میں نے اُسے مارا نہیں بلکہ اس جنگ کے چھڑ جانے سے میرے جذبۂ انتقام نے ایک بہت ہی عمدہ تجویز پیش کی۔ چنانچہ میں نے اپنے دوستوں کی معرفت اُسے فوج میں داخل کر دیا۔"

"فوج!؟" گلریز نے سراسیمہ ہو کر کہا "فوج! کیا وہ پونا میں ہے؟"

"نہیں" روزی اطمینان سے بولی "میں نے اُسے کورپورل بنوا دیا تھا۔ یہ لڑائی تو دُنیا کی دوسری جنگ عظیم ہے نا؟ پچھلی جنگ سے زیادہ ہولناک اور تباہ کار —— بس! اور

ہاں، یہ آخری تصویر بھی تو دیکھو جو اُس کے ہندوستان سے روانہ ہونے سے پہلے اُس کی اُنیسویں سالگرہ کے موقع پر میں نے کھنچوائی تھی۔ یہ ..... کورپورل اراطون کسقدر ہنسمکھ اور خوش جمال نوجوان ہے!"

گلریز کی آنکھوں میں بے اختیار آنسو آگئے اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اُس کی تمام قوت اس وقت سلب ہو چکی ہے۔

روزی نے قہقہہ لگایا "موسیٰ کی قسم! میدانِ جنگ میں کسی سُرنگ کی بارود سے اس کے جسم کی دھجیاں اُڑ جائیں گی۔ یا کوئی بمبار طیارہ اُس کے بدن کو تنکے تنکے کر دے گا۔ لیکن نہیں وہ تو اس سے زیادہ ہولناک سزا کا مستحق ہے۔ کاش دشمن کی مسٹرڈ گیس اس کے تمام جسم میں پھپولے ڈال دے۔ جن کی جلن اور ٹیسوں سے وہ تڑپ تڑپ کر مرے یا سمندری لڑائی میں کوئی سب میرین جہاز کو تارپیڈو کر کے اراطون کو آگ کے شعلوں میں جھلس دے..... بلکہ مجھے تو اُس وقت چین پڑے جب بڑی بہادری سے لڑتے ہوئے اُسکی موت نہایت دردانگیز اور خوفناک طور پر واقع ہو اور سرکار مرنیکے بعد اُسکے لئے وکٹوریہ کروس عطا کرے جسے تمہارے سینے پر آویزاں کیا جائے!"

روزی ششدر رہ گئی۔ اُس نے دیکھا کہ میری طرح گلریز بھی قہقہہ لگا رہا ہو مگر اس قہقہے کے ساتھ اسکی گھگی بھی بندھی ہوتی ہو۔ اسکے سر کے بال کھڑے ہو گئے ہیں، اسکی پنڈلیاں تھرتھرا رہی ہیں۔ اُس نے اپنے کپڑے پھاڑ ڈالے ہیں۔ اور جب یکایک وہ ایک دلدوز چیخ مار کر یہ کہتا ہوا دروازے کی طرف لپکا:۔

"اراطون! کورپورل اراطون! وکٹوریہ کروس ہرگز نہ لینا۔ ہرگز نہ لینا ـــ اراطون ـــ میرے بچے! ......"

تو روزی خوشی سے اُچھل پڑی ـــ گلریز کا دل اُلٹ گیا تھا۔

چُرائی ہوئی ڈائری

آج کی صحبت میں، مَیں آپ کو ایک مشہور اور ترقی پسند افسانہ نگار کی ڈائری کے چند مختلف اوراق سُناتا ہوں جس کے افسانے عوام اور خواص دونوں میں بڑی دلچسپی سے پڑھے جاتے ہیں۔ لیکن میں آپ کو اس کا نام نہیں بتاؤں گا۔ یہ اور بات ہے کہ آپ اس روزنامچے میں بھی اس کے تخیلات اور اس کے اسلوب بیان کی جھلک دیکھ لیں۔

وُہ میرا عزیز تریں دوست ہے۔ میں نے اس کو ہر پہلو سے دیکھا ہے اور میں جانتا ہوں کہ صداقت اس کا اصولِ حیات ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اُس کے افسانوں میں تصنّع اور ریا کاری نہیں ہوتی۔ جو کچھ اس کے دل میں ہوتا ہے وہ اُسے ظاہر کر دینے میں بالکل نہیں جھجکتا، چاہے اس کا یہ بیان دوسروں کے لئے ہو چاہے خود اپنے لئے! ایک دفعہ اتفاقاً مجھے اُس کی ڈائری نظر پڑی اور میں نے اُسے پڑھنا شروع کر دیا لیکن مَیں ابھی تھوڑا ہی سا پڑھنے پایا تھا کہ اُس نے یہ کہہ کر ڈائری میرے ہاتھ سے چھین لی کہ "یہ بہت پرائیویٹ ہے" مگر جتنا حصّہ میں پڑھ چکا تھا اُس سے مجھے بڑی حیرت اور لذّت محسوس ہوئی اور میں نے ارادہ کر لیا کہ جس طرح بھی ہوگا میں یہ ڈائری ضرور پڑھوں گا۔ چنانچہ میں نے اُسے چُرایا۔ اور اب اُسے کہیں کہیں سے آپ کو بھی سُناتا ہوں۔

ان صفحات میں گوناگوں کیفیات درج ہیں اور سب سے بڑھکر یہ کہ تمام ڈائری میں ایک طرح کا ربط اور تسلسل ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ سچ مچ بیتی ہوئی زندگی کا ایک سادہ اور دلکش فلم ہے جس کے مختلف مناظر میں تنوّع ہونے کے باوجود لچک اور ایک دوسرے میں ضم ہوجانے کی صلاحیت ہے۔ مزید برآں اس روزنامچے کو پڑھکر ذہن میں اُس کے افسانوں کا پس منظر مرتب ہوجاتا ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جو واردات اُس کے افسانوی کرداروں کو پیش آتی ہیں بسا اوقات وہ خود بھی اُن میں مبتلا ہو۔

---

۴ ر اکتوبر ــــــ

آج کافی رات گئے روزنامچہ لکھنے بیٹھا ہوں، اور یہ اس لئے کہ میں بہت دیر تک اپنی بالکنی میں کھڑا ایک رُوح پرور تماشہ دیکھتا رہا۔ اس شہ نشین کا رُخ میرے مکان کی پچھلی جانب ہے جہاں تاڑ کے لانبے لانبے دیو آسا درخت آسمان کی آوارہ ہواؤں سے سرگوشیاں کیا کرتے ہیں۔ اُن کے قدموں میں سبزۂ خوابیدہ بچھا ہوا ہے، اور اس مختصر سے پُر سحر مرغزار کو دیکھکر مجھ پر ہمیشہ ایک ناقابلِ بیان کیف طاری ہوجاتا ہے، خصوصاً اس وقت جب اس کے شمالی گوشے سے سمندر کی سرکش لہریں اپنے جذبات کے جوش میں اس ننھے سے چمن زار کو آغوش میں لے لینے کے لئے قریب سے قریب تر آجانا چاہتی ہیں۔ اور قریب، اور قریب، لیکن نہیں آسکتیں۔ بلکہ صرف ایک تکون شکل بناکر چند گز کے فاصلے پر مچلتی رہ جاتی ہیں۔ میں حسب معمول اس نظارے سے، جو اب میری تنہائیوں کا رفیق اور میری دل بستگی کا اکیلا سامان رہ گیا ہے، سرور حاصل کر رہا تھا کہ میں نے اسٹیج کے (Transfer Scene) کی طرح اس چمن میں ایک اور روپ دیکھا۔ میرے پڑوسی یہودی عزاکیل کی لڑکی، نامِ خدا، پندرہ سولہ کا سن، اپنے ہم جلیسوں کے ساتھ چاندنی رات کا لطف اُٹھانے آئی، اور وہ سب مل کر کوئی ایسا کھیل کھیلنے لگے

جو کسی طویل اور قدیم داستان کا ایک محیر کن ٹکڑا معلوم ہوتا تھا۔ مجھے وہ کھیل یاد نہیں اور نہ اُن لڑکوں کے چہرے یاد ہیں جن کے ساتھ وہ اپنے حُسن و شباب سے بے خبر، معصوم اور الھڑ، قدم قدم پر فتنے جگاتی، بڑی آزادی اور بیباکی سے گھل مل رہی تھی، میں صرف اُسے دیکھتا رہا اور دیکھتا گیا، گویا اس وقت تمام کائنات اس ایک نقطے میں سمٹ آئی تھی۔

کسی نے اُسے پکارا "للی!" اور میں نے آپ ہی آپ کہا واقعی یہ پھول ہے۔ اس میں سوسن کی مانند نزاکت اور رعنائی ہے۔ لیکن یہ ابھی کھلا ہوا پھول نہیں، بلکہ غنچۂ نوشگفتہ ہے، گلِ نوبہار! اور جوں جوں میری نظریں اس پر جمتی گئیں، طائر خیال ماضی کے کسی بھولے بسرے آشیانے کی طرف پرواز کرتا گیا اور مجھے اس دوشیزۂ سرمست کے خدوخال میں ایک اور چہرہ نظر آنے لگا جس نے میری حیات گذشتہ کو رنگین بنا دیا تھا۔ اور آہستہ آہستہ وہ بھولی ہوئی صورت میرے دل و دماغ پر اس قدر مسلّط ہوئی کہ میں مجسّم تمنّا بن گیا "کاش اس تمام عمر، تمام علم اور تمام اثاثے کے بدلے مجھے پھر کوئی وہی بچپن کے دن دیدے!" مگر نہیں۔ اب یہ کیسے ممکن ہو سکتا ہے؟ بچپن کی حدود سے نکل کر تو ہم سوسائٹی کے وضع کئے ہوئے قوانین میں جکڑ جاتے ہیں اور ہم کو الگ الگ مضبوط قلعوں میں مقیّد کر دیا جاتا ہے۔ اس لڑکی نے ناحق دس برس سال پہلے کی بات یاد دلا دی۔ اب میں کہاں اور وہ بچپن کی شہزادی کہاں؟ وہ تو گویا زندگی کی ندی پر ایک تناور درخت کا سایہ تھی، زندگی بہا کی، سایہ پیچھے لیتا رہا یہاں تک کہ وہ درخت وہاں ہٹا دیا گیا۔ ندی اب بھی بہتی ہے اس کی سطح خالی ہوگئی مگر اسکے سینے میں ایک عکس، ہلکا سا نقش ابھی اب بھی باقی ہے اسے کون مٹا سکتا ہے؟ میرے دل میں بے اختیار آیا کہ میں اُسے جا کر بتا دوں کہ میں وہی ہوں! تم کو تو کیا یاد ہوگا؟ وہ گذری ہوئی دلچسپیاں؟ وہ بیتی ہوئی باتیں؟ لیکن میں اب یہ سب کچھ کیسے کہہ سکتا ہوں؟ اس کی تو شادی ہوگئی ہے۔ انجان اور

اجنبی۔ وہ کیوں سُنے گی؟ اور پھر، یہ کیا ضروری ہے کہ محبوب کو اپنی محبت ضرور ہی جتائی جائے؟ دل کے صنمکدے میں اسکی یاد ہی کیوں نہ محبت کی شمع روشن رکھے!

اور یہ سطور لکھتے لکھتے میرے ذہن میں ایک افسانے کا پلاٹ تیار ہو گیا ہے جس میں مَیں ایک ایسا کردار پیش کروں گا جو اپنی شدید اور انتہائی محبت کا علم اپنی محبوبہ کو نہیں ہونے دیتا، مبادا کہ اس سے اس کو کسی قسم کا نقصان پہونچ جائے۔ وہ اپنے درد کو اپنے ہی دل میں محفوظ رکھتا ہے۔ گویا وہ اپنی محبوبہ کو ایک بیش بہا شئے دیدیتا ہے مگر اس کا معاوضہ طلب نہیں کرتا۔ یہ محبت کا ایک مثالی کردار ہوگا۔

(۲)

یکم جنوری

آج کتاب زندگی کا ایک اور ورق اُلٹ گیا۔ زمانے کی اس کروٹ نے سال گذشتہ کو ہمیشہ کے لئے ماضی کی آغوش میں سُلا دیا۔ اور اب وہ صرف اس لائق رہ گیا ہے کہ ہم اس کا جائزہ لے لیں۔ جو جو کچھ اس دوران میں بیتا ہے اس پر تبصرہ کرلیں۔ اسکے روشن اور اُجلے پہلو پر ذرا خوش ہوں اور تاریک و مغموم رُخ پر اُداس۔ لیکن میرے نزدیک یہ پچھلا سال بہت اہمیت رکھتا ہے، کیونکہ اسی سال میں نے اپنی افسانہ نگاری کا عروج پایا۔ میں نے اس سال دو درجن سے زائد افسانے لکھے اور یہ سمجھنے میں مجھے مطلق غلط فہمی نہیں ہے کہ ان میں سے بعض اس سال کے بہترین افسانے ہیں۔ مجھے اُنکے پلاٹ یاد ہیں اور میں ایک نقاد کی طرح جب ان پر تبصرہ کرتا ہوں تو اُن میں جدّت، تازگی اور زندگی کی لہر پاتا ہوں۔ میں نے ان افسانوں سے اپنے لئے ایک دُنیا بنائی ہے اور میری تمنا ہے کہ میں اسی میں گم رہوں۔ میرا ذہن کردار تخلیق کئے جائے اور میں اپنے کرداروں میں گھرا رہوں۔

مجھے اپنی افسانوی کامیابیوں اور مبصروں کی داد و تحسین سے جہاں خوشی ہوتی

ہے، وہاں لوگوں کے اعتراضات بھی مجھے ایک لمحۂ فکریہ دیتے ہیں۔ میری تحریروں میں جو جو نقائص نکالے جاتے ہیں، مَیں اُن پر سرسری نگاہ ڈالتا ہوا نہیں گذر جاتا بلکہ ان پر غور کرتا ہوں اور اُن لوگوں کو اپنا کرمفرما سمجھتا ہوں جنہوں نے مجھے اس طرف متوجہ کیا۔

ان دنوں سب سے زیادہ اعتراض یہ ہے کہ میں شوخ نگار ہوں۔ میرے افسانوں میں عریانی بہت ہے اور میں نازک سے نازک موضوعات پر اس قدر آزادی اور بیباکی سے اظہارِ خیال کرتا ہوں کہ بعض اوقات اخلاقیات کو مجروح ہونے کا اندیشہ ہونے لگتا ہے۔ میں نے اس اعتراض پر بہت کافی سوچا، اس لئے نہیں کہ میں اس کا جواب دینا چاہتا ہوں، بلکہ محض اس لئے کہ اگر ادبیات میں سوائے اخلاقیات کے کسی اور چیز کی گنجائش نہیں ہے تو میں لکھنا لکھانا بالکل چھوڑ دوں۔ یا کم از کم لکھنے سے پہلے اپنے خیالات والفاظ پر اخلاقیات کا سنسر بٹھا دوں۔ جس کے معنی یہ ہونگے کہ میری تحریروں میں سے بے ساختگی اور صداقت بالکل مٹ جائے۔ لیکن نہیں۔ ایسا نہیں ہے۔ میرے ذہن میں اس اعتراض یا عیب کا ایک ہی جواب پیدا ہوتا ہے اور وہ بھی بصورت استفسار، یعنی، "کیا آرٹ کے لئے معلم اخلاق ہونا ضروری ہے؟ کیا آرٹ کے لئے یہ ممکن نہیں کہ وہ اخلاقیات کی قیود سے بالکل آزاد ہو جائے اور پھر بھی آرٹ رہے؟"

۳

۱۸ مارچ

کل میں نے اس سلسلے میں کہ "میں افسانہ کیونکر لکھتا ہوں"؛ ایک افسانہ نگار کا مضمون پڑھا جس میں اُنہوں نے اس بات پر ضرورت سے زیادہ زور دیا ہے کہ اُن کے افسانے طبعزاد ہوتے ہیں۔ میری طبیعت میں فوراً شرارت ناچنے لگی اور

میں نے سوچا، یہ عنوان تو پرانا ہو چکا۔ اس کی بجائے یہ کیسا رہیگا۔

"میں افسانہ کیونکر چراتا ہوں"

اس عنوان پر کتنے ادیب لکھنے کی جرأت کر سکیں گے؟ کتنے لوگ ہیں جو سچ سچ بتا دیں کہ انہوں نے اپنے فلاں افسانے کا پلاٹ فلاں افسانے یا فلاں مصنف سے چرایا ہے، چرانا نہ سہی، یہ ذرا زیادہ سخت ہو جائے گا۔ وہ یہی اقبال کر لیں کہ اُن کے زیادہ تر افسانے دوسروں کے رہین منت ہیں۔ اور دوسروں کے متعلق سوچتے سوچتے بالآخر میں اپنے متعلق سوچنے لگا۔

میں نے اپنے آپ سے کہا "پہلے تم ہی بتا دو! تمہارے کتنے افسانے خود تمہاری اپنی پیداوار ہیں؟ کیا تم کو اقرار نہیں کہ تمہارے افسانے "بہار و خزاں" کا پلاٹ، جس نے تمہاری شہرت کو چار چاند لگا دئے، ایک ایسی کہانی سے ماخوذ ہے جو ایک معمولی ادیب کے قلم سے شائع ہوئی؟ اور پھر "قفس کی تیلیاں" کے متعلق کیا رائے ہے؟ کیا اس کا بنیادی خیال تم نے ٹیگور کے افسانے سے نہیں لیا؟......" غرض اس قسم کے بہت سے خیالات میرے دماغ میں گردش کرنے لگے اور میں اپنے بعض اُن افسانوں کے متعلق جن پر مجھے ناز ہے، تذبذب کے عالم میں رہ گیا کہ کہیں یہ سچ تو نہیں؟

میں نے یکایک محسوس کیا کہ یہ سوال محض مذاق اور شرارت کی حد سے نکل کر خاصی سنجیدگی اختیار کر گیا ہے۔ اور اس کی روشنی میں جب میں نے اپنے چند افسانوں کا تجزیہ کیا تو میری حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی۔ میں نے اپنے تازہ ترین افسانے "وہ فسردہ نگاہیں" کو لیا اور اس کے متعلق سوچتا رہا کہ اُس نے میرے ذہن میں جنم کیونکر لیا؟ اس کی ابتدا کیسے ہوئی؟ اس کے پلاٹ نے کس طرح نشو و نما پائی؟ اور میں بہت کچھ سوچ بچار اور بہت دیر تک غور و فکر کے بعد اس نتیجے پر پہونچا کہ انسانی ذہن یقیناً ایک خالی تختی (Tabula Rasa) کی مانند ہے جس پر مختلف النوع نقوش

ذاتی تجربے اور مشاہدات کے ساتھ ساتھ اجاگر ہوتے رہتے ہیں اور ان اثرات کو پروان چڑھانے کے لئے خود انسانی ذہن کو ایک مستور قوت ودیعت کی گئی ہے۔ اسی کے بل پر ہمارے تاثرات ڈھلتے ہیں اور ہم ایک چراغ سے دوسرا چراغ روشن کئے جاتے ہیں۔ مستقبل حال میں اور حال ماضی کی گود میں پرورش پاتا ہے! بس اسی طرح افسانہ نگار کسی خاص چیز سے متاثر ہوتا ہے۔ اس کے تخیل کی آنکھ پچھلے اثرات کی روشنی میں ایک نامکمل سی تصویر کا دھندلا سا خاکہ دیکھنے لگتی ہے۔ اس کا حساس ذہن اس خاکے میں نقوش بھرنے لگتا ہے اور جب افسانہ نگار الفاظ کے ذریعے اپنے مافی الضمیر کو پوری قدرت کے ساتھ بیان کر دیتا ہے تو وہ ایک مکمل سراپا، ایک دلکش صنم، ایک نک سے سک تصویر بن جاتی ہے۔ میرا افسانہ "وہ فسردہ نگاہیں" اسی خیال آفرینی اور انگیخت کی ایک مثال ہے۔ کئی سال ہوئے میں نے ایک انگریزی فلم (Queen Christina) دیکھا جس کا خاتمہ ملکہ کی آنکھوں پر کیا گیا۔ اور کیمرہ نے انہیں اس قدر نمایاں کر دیا تھا کہ وہ میرے نفس تحت الشعور میں محفوظ ہو گئیں۔ اور اب جو سالہا سال گذرنے کے بعد میں نے یہ کہانی لکھی تو اس میں میں نے آنکھوں کو غیر ارادی طور پر اس قدر نمایاں جگہ دی کہ اس کا (Climax) ہی ان سے پیدا ہوتا ہے۔ مگر میرے افسانے کا اس فلم سے کوئی تعلق نہیں۔ میرا پلاٹ اس سے کہیں اثر پذیر نہیں ہوا۔ اس لئے کوئی یہ تو نہیں کہہ سکتا کہ میں نے یہ افسانہ اس فلم سے چرایا ہے۔ ہاں جیسا کہ میں ابھی کہہ چکا ہوں ایک دیئے سے دوسرا دیا جلتا ہے۔ ایک خیال سے دوسرا خیال پیدا ہوتا ہے۔

(۴)

۱۲۔ امئی

دن بھر رحمان علوی کے افسانوں کا نیا مجموعہ پڑھتا رہا جو انہوں نے از راہ عنایت

مجھے تحفتاً بھیجا ہے۔ اِن افسانوں کی خصوصیت جنسی تعلّقات کا پُرجوش و رنگین بیان ہے کہیں کہیں مزاح اور طنز بھی نظر آتی ہے۔ مگر یہ کوئی ایسی زبردست خوبیاں نہیں ہیں جن کی وجہ سے ان افسانوں کو اس قدر اُچھالا جائے۔ پھر بھی اخبارات و رسائل میں ان افسانوں کا چرچا ہے اور علوی کی افسانہ نگاری پر مقالے شائع کئے جا رہے ہیں لیکن ایسا کیوں ہے؟ کیا ہمارے نقّاد ہمیشہ پروپگنڈے کے زیرِ اثر رہیں گے؟"

مجھے علوی پر رشک آتا ہے کہ اُسے افسانہ نگاری میں وہ جگہ بہت جلد مل گئی جو میں نے اب جا کر حاصل کی ہے۔ بات یہ ہے کہ بعض افسانہ نگاروں کو عظمت نصیب ہوتی ہے، بعض کو شہرت۔ بعض کو دونوں، اور بعض کو کچھ بھی نہیں۔ گویا یہ بھی اُس کی دین ہے، جسے چاہے نوازے۔ یا اس کی دین نہیں تو رسائل کے ایڈیٹروں کا کرم ہو۔ جسے چاہیں بڑھائیں۔ علوی کی شہرت اسی لئے روز بروز ترقی پا رہی ہے کہ ایڈیٹروں سے اس کے تعلّقات ہیں، جب ہی تو اُس کے ہر افسانے کو خواہ وہ کتنا ہی معمولی ہو بڑی شان سے چھاپا جاتا ہے، اور میں حیران ہوں کہ ہمارے دیس میں عظمت اور شہرت بھی دوستی کے سہارے پلتی ہے۔ لیکن صرف ہندوستان پر یہ الزام شاید زیادتی ہوگی۔ دُنیا کے بڑے بڑے تعلیمیافتہ ملکوں میں بھی یہ پروپگنڈا، یہ دوست نوازی یہ وطن پروری بڑی زبردست اہمیت رکھتی ہے۔ علوی خوش قسمت ہو کہ وہ اس خطے کا رہنے والا ہو جہاں کے ذرّے کو آفتاب بنانے کی کوشش کی جاتی ہے۔

مجھے علوی سے کوئی پرخاش نہیں، بلکہ میں نے اس کے بعض افسانوں کی فراخدلی سے داد دی ہے۔ مگر جس انداز سے اس کی افسانہ نگاری کا اشتہار دیا جاتا ہو اس سے خواہ مخواہ چڑ پیدا ہوتی ہے اور سمجھدار قارئین کی نظروں میں ایسے ادیبوں کی کوئی وقعت نہیں رہتی۔ پھر بھی پروپگنڈا کام کرتا ہے۔ زیادہ تر لوگ تو دوسروں کی آراء اور اشتہارات کے مبالغوں سے مرعوب ہوتے ہیں۔ اسی لئے علوی کے افسانوں کو

مقبولیت حاصل ہے۔ یا پھر ان افسانوں کی پسندیدگی کی وجہ ان کا موضوع اور طرزِ بیان ہے یعنی جسمانی بھوک اور اس کا ہیجان بپا کرنے والا بیان۔ جب ہی تو ایک سال میں اُس کے افسانوں کے پانچ مجموعے شائع ہو گئے۔ اس کے برخلاف اچھے افسانہ نگاروں کے مجموعے بہت کم کتابی صورت میں چھپتے ہیں۔ لیکن ایک زمانہ آئے گا جب پروپگنڈے کا اثر زائل اور تعمیری ادب کی تحقیق اور چھان بین ہوگی۔ کس افسانہ نگار کا نام زندہ رہے گا اور کون کون سے افسانے تابندہ رہیں گے، یہ فیصلہ مستقبل کے بطن میں محفوظ ہے۔ جب صحیح تنقید نگاری کا رواج ہوگا، جب درحقیقت عمدہ افسانے کی قدر ہوگی تو تاریخ اُن ناموں کا ذکر کرنے سے ہرگز نہیں جھجکے گی جنہیں واقعی آسمانِ ادب پر روشن ستاروں کی طرح جگمگانے کا حق ہے۔

۵

۷ جولائی

میں نے افسانہ نگاری میں جو نئی راہ اختیار کی ہے، لوگ اس پر متعجب ہیں۔ فانوس کے افسانہ نمبر میں میرا تازہ افسانہ شائع ہوا ہے۔ اس پر تبصرہ کرتے ہوئے ایڈیٹر صاحب نے چند باتیں بڑی دلچسپ لکھی ہیں: "...... ادھر کچھ عرصے سے ہم اُن کے افسانوں میں تبدیلی دیکھ رہے ہیں۔ ان کے ہاں اب وہ پہلی سی حسن و عشق کی حکایتیں نہیں ہوتیں، بلکہ اب زندگی کی دوسری کیفیات ان کا مرکزِ نگاہ بن گئی ہیں۔ رومان نگاری اب یہ قریب قریب ترک کر چکے ہیں، اس کی بجائے، حیات اور اس کی تلخیاں ان کا موضوع بنتی جا رہی ہیں ۔۔۔"

اسے پڑھ کر میرے دل پر ایک چوٹ سی لگی، کیونکہ جس تبدیلی کی طرف ان سطور میں اشارہ کیا گیا ہے وہ صرف افسانہ نویسی ہی میں نہیں بلکہ میری زندگی میں واقع ہو گئی ہے۔ مجھے یہی احساس ہے کہ میرے تخیلات میں وہ شاعرانہ رنگینیاں نہیں رہیں،

میرے تصوّرات میں وہ غیر خیالی ولولے نہیں رہے۔ میری جولانگاہ اب یہی دنیا، یہی سچ مچ کی زندگی اور یہی اس کا غیر متناسب نظام ہے۔ لیکن کیوں؟ ایسا کیوں؟

یہ اس لئے کہ وہ میری طالب علمی کے دن تھے۔ کالج کا زمانہ یوں بھی خوش باش اور ہر قسم کے فکروں سے آزاد ہوتا ہے۔ زندگی اور اس کی تلخیوں کو ان کے اصلی رنگ روپ میں دیکھنے کا مجھے کبھی موقع ہی نہیں ملا۔ پھر میرے افسانے ادب برائے ادب کا نمونہ کیوں نہ ہوتے؟ ان میں ادب برائے زندگی کی صلاحیت کیسے پیدا ہوتی؟ اور اب جو میں آسمان سے زمین پر اتر آیا، خیالی بستی کی بجائے اسی جیتی جاگتی دنیا سے واسطہ پڑا، جہاں خوشیاں کم اور دکھ زیادہ ہیں، جہاں آرام قلیل اور آزار بہت ہیں تو میرے احساسات بھی بدل گئے۔ میرا ذہن نئی نئی تصویریں بنانے لگا، اور گذشتہ خاکے، حسن و رومان کے شگفتہ نقوش، خودبخود دھندلے ہوتے گئے۔ ممکن ہے ان لوگوں کے لئے جو میرے جذباتی افسانوں کو پڑھکر میرے متعلق کوئی خاص رائے قائم کر چکے ہیں، جو مجھے صرف حسن و محبت کا داستان گو سمجھتے ہیں، میرے افسانوں کے موضوع کی تبدیلی باعث تعجب ہو، لیکن میں مجبور ہوں، میرے تخیّل کو اب اتنی فرصت ہی نہیں کہ وہ پھر ایک دفعہ ماضی کی طرف لوٹ جائے۔ ایک دفعہ پھر انہی رومانی داستانوں کو دہرانے لگے۔ اب روح سے زیادہ جسم کشمکش میں ہے۔ اسی کے آرام سے روح کو بھی سکون ملتا ہے۔ جب تک جسم ابتلا میں رہے روح کی خلش برقرار رہیگی۔ روح سے میرا مطلب وہی احساسات ہیں جو جسم اور جان کے ساتھ ساتھ ہیں، وہ نہیں جو جسم سے غیر متعلق ہے۔

۶

۱۳ نومبر

آج مجھے ملازم ہوئے پورا ایک سال ہو گیا۔ اس عرصے میں گنتی کے چند افسانے

لکھ سکا۔ مجھے لکھنے کی فرصت ہی نہیں ہوتی، لیکن اس دوران میں میں نے وہ وہ تجربے حاصل کئے ہیں جو تمام عمر یاد رہیں گے کہ ان میں مٹھاس کم اور کڑواہٹ زیادہ ہے۔ ملازمت بھی کیسی بیہودہ چیز ہے؟ انسان تھوڑی سی دولت کے لئے اپنا سب کچھ قربان کر دیتا ہے! اسکی آزادی، اسکی بے فکری، اسکی حمیت، غرض اسکی ہر وہ شریفانہ خصوصیت جو انسانیت کا تقاضہ ہے، اس سے چھین لی جاتی ہے۔

افسر اور ماتحت کے تعلقات خود اپنی جگہ ایک مستقل باب ہے۔ افسر ہنسے تو ماتحت کو ہنسنا ضروری۔ افسر کسی پر ناراض ہو تو ماتحت کو اس کی ہاں میں ہاں ملانا لازمی چاہے وہ جانتا ہو کہ افسر غلطی پر ہے۔ لیکن اس کو ٹوک دینے کی اس میں ہمت نہیں ہوتی۔ اسکی کوشش تو یہی ہوتی ہے کہ جس قیمت پر بھی ممکن ہو افسروں کی خوشنودی حاصل کرے اور موقع پڑنے پر وہ اپنی حدود سے بھی تجاوز کر جاتا ہے۔ اُس کی غیرت اور عزت دھری رہ جاتی ہے۔

چند سال ہوئے میں نے ایک افسانہ لکھا تھا "پابند" یہ میری طالب علمی کی یادگار ہے۔ اس افسانے کو آج میں نے خاص طور پر پڑھا، لیکن اس حصے میں جہاں میں نے اک کلرک کی دفتری زندگی بیان کی ہے، مجھے رنگ کچھ پھیکا نظر آیا۔ اسے اور زیادہ گہرا ہونا چاہیئے تھا۔ لیکن اس پھیکے پن کی وجہ یہی ہے کہ اس وقت میں روزگار اور نوکری کی پابندیوں سے ناآشنا تھا۔ وہ تمام تاثرات جن پر اس افسانے کا دارومدار تھا میرے ذاتی نہیں تھے۔ میں نہیں جانتا تھا کہ ملازمت اختیار کرنے کے بعد انسان کس قدر مجبور اور غیر انسان ہو جاتا ہے۔ اور اب سوچتا ہوں کہ یہ افسانہ میں پھر سے لکھوں۔ کسی پابند ملازمت کی زندگی نئے سرے سے بیان کروں اور اسکے پلاٹ کیلئے مجھے دور نہیں جانا پڑیگا۔

۷

۱۴ دسمبر

آجکل جدید رجحانات اور نئے نئے قسم کے افسانے ہماری ادبیات میں اضافہ کر رہے ہیں۔ یہ زبان اور لٹریچر کے حق میں نیک فال ہے۔ لیکن "ترقی پسند" افسانوں کے نام سے جس نوع کا ادب پیش کیا جا رہا ہے اُسے مدِنظر رکھتے ہوئے کم ازکم میں تو "ترقی پسند افسانہ نگار" کہلانا ہرگز گوارا نہیں کرتا۔ ان افسانوں کا بنیادی خیال محض جنسی تعلقات اور نفسانیت ہے، اور یہ ترقی پسند افسانہ نگار اسی ایک خیال کو ہیر پھیر کر اور اس پر طرح طرح کے پلاٹ بنا کر پیش کئے جاتے ہیں۔ اس پر طرہ یہ کہ ان کے ہاں فحش نویسی کی حد تک بڑھی ہوئی عریانی کا خاص اہتمام کیا جاتا ہے۔ اور چونکہ عریاں افسانے ہمارے عوام میں قدرتی طور پر مقبول ہوتے ہیں اس لئے یہ سیلاب بڑھتا ہی چلا جاتا ہے۔ مگر اس قسم کی چیزوں کو "ترقی پسند ادب" کہہ کر ادب کو کیوں بدنام اور مجروح کیا جائے؟ آخر لٹریچر اور کوک شاستر میں کچھ تو امتیاز ہونا چاہیئے۔ ادب ایک نازک فن ہے، اس کی حدود سے ذرا تجاوز کیا اور اسکی پاکیزگی جاتی رہی! لیکن ہمارے جدید افسانہ نگار ان نزاکتوں اور فنی لوازمات کو نہیں سمجھتے یا سمجھنا نہیں چاہتے۔

مجھے اپنے گذشتہ خیالات یاد آئے تو ہنسی آگئی۔ ایک زمانہ میں میں بھی آرٹ برائے آرٹ اور ادب برائے ادب کا حامی تھا، مگر اب یہ رائے بدل چکی ہے۔ بیشک آرٹ اگر معلّمِ اخلاق نہ ہو، تو بھی آرٹ رہتا ہے، لیکن اگر مخربِ اخلاق ہو تو اسکی قدر یقیناً کم ہو جاتی ہے۔ کم ازکم وہ پاکیزہ آرٹ نہیں رہتا، جو اس آرٹ سے یقیناً بہتر ہوتا ہے جو خیال کو بلندی کے بجائے پستی کی طرف لے جائے۔ ادب کا بھی یہی حال ہے۔ اگر ہم اس میں عریانی اور جنسی تعلقات کو نازیبا طور پر نمایاں جگہ دیدیں تو یہ ادب کہاں رہیگا؟ اور پھر اسکی ضرورت بھی کیا ہے؟ جنسی لٹریچر کی ہمارے ہاں کمی تو نہیں!

"ادبِ جمیل" کے سالنامہ میں ایک افسانہ "رضائی" پڑھا۔ یہ ایک مشہور افسانہ نگار خاتون کے ذہن کی پیداوار ہے اور اس میں جنسیت ایک نئے زاویے سے جلوہ گر ہوتی ہے۔ افسانے

کے کیا کہنے! تحریر کا زور لائقِ تحسین، مگر موضوع وہ کہ جسے ادب کے لطیف تصوّرات برداشت نہیں کر سکتے۔ اور میں حیران ہوں کہ یہ افسانہ ایک عورت کے قلم سے ہے جو ہندوستانی بلکہ خالص مشرقی ہے لیکن محض آرٹ کے دھارے پر وہ کس قدر تیزی سے بہی جا رہی ہے؟ مگر یہ سب کچھ شاید ردِّ عمل ہے۔ ہندوستان میں عورت اور اُس کے جذبات و احساسات کو ہمیشہ دبا کر رکھا گیا۔ دل کی بھڑاس نکالنے کا اس کو ذرا بھی موقع نہیں ملا۔ عورت اسی کا بدلہ لے رہی ہے اور لیتی رہے گی۔ یہاں تک کہ مرد چیخ اُٹھیں گے اور وہ ہنستی رہیگی۔ آخر ایک وقت آئے گا جب عورت کی ہنسی قہقہے میں اور مرد کی چیخ سسکی میں تبدیل ہو جائیگی ——— اور پھر کچھ نہ ہوگا، بس شاید سنّاٹا۔

(سنہ ۴۲ء)

(ایک طویل رومان تین ابواب میں)

باب اوّل

خواب کی دُلہن

ایک فنا کا جھونکا آیا اور وہ شمع شبستانِ حیات جھلملا کر گُل ہو گئی۔ پرویز چُپ چاپ دیکھا کیا۔ سب کچھ سہا کیا اور سوائے ہاتھ مل کر رہ جانے کے کچھ نہ کر سکا۔ وہ اُسکی ہمدم و غمگسار تھی۔ صحیح معنوں میں شریکِ زندگی اور رفیقِ حیات تھی۔ اُس نے اُس کے آرام کی خاطر اپنے سُکھ کو ہمیشہ قربان کیا تھا۔ بلکہ جب سے وہ اُس کی ہمرازِ خلوت بنی تھی، اُس نے ہر لمحہ یہی کوشش کی کہ وہ پرویز کے لئے راحت و سکون کا سامان فراہم کرے۔ اور پرویز کو اعتراف تھا کہ اس نیکنامی و عزّت، اس دولت و عظمت کا باعث وہی اسکی مرحوم بیوی ہے جو اُس کی ناکامیوں اور مایوسیوں کے لئے فتح و نصرت کا پیام لائی، جس نے اُسے بار ہا گرتے ہوئے سنبھالا اور جس نے آخرِ کار، اپنی سعیٔ پیہم سے اُسے بامِ عروج پر پہونچایا۔ لیکن یہ جلوۂ مختصر کیوں؟ کیوں وہ اس قدر جلد رخصت ہو گئی؟ اس کا کوئی کیا جواب دے! پیامِ مرگ کون رد کر سکتا ہے؟ عالمِ شباب سہی، پیکِ اجل تو نہیں ٹالا جا سکتا؟ اسی لئے سب کوششیں اکارت گئیں۔ ساری دوڑ دھوپ بیکار ثابت ہوئی۔ یہاں تک کہ موت اس کے سرہالیں رقص کرنے لگی۔ پرویز کو یقین ہو گیا کہ اب ڈاکٹر اُسے نہیں بچا سکتے۔ اور کوئی دم میں یہ لحد کی آغوش میں جا سوئے گی۔ یہی ہونا بھی تھا۔ وہ دھان پان، دلّی کی دلہن، وفا کیش و جانِ بہار، جس کی پالکی ایک دن بڑی

دھوم دھام سے اس کے ہاں آئی تھی، اُس کی میت بصد حسرت و رنج اُس اور اُس کے گھر سے نکلی۔

پرویز ہنس کی طرح زخم کھا کر خاموش ہو گیا۔ اُسے اِس کا بڑا ملال تھا کہ جاتے جاتے رعنا نے مجھ سے کوئی بات چیت نہیں کی۔ کوئی خواہش ظاہر نہیں کی۔ کوئی وعدہ نہیں لیا۔ وہ صرف اُسے تکتی رہی ٹکر ٹکر دیکھتی رہی شاید وہ زبانِ خموش سے کچھ کہہ رہی تھی لیکن وہ ان نظروں کو نہ پہچان سکا۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ دمِ واپسیں زبان کا کام نگاہ دیتی ہے۔ اسی لیے وہ اس کا پیغام سمجھنے سے قاصر رہا، حالانکہ وہ آنکھوں ہی آنکھوں میں بہت کچھ کہتی رہی۔ وہ اب بھی اُسے دلاسہ دے رہی تھی۔ کہہ رہی تھی "میرے غم میں یوں آنسو نہ بہانا ـــــ میری رُوح کو یوں رنج نہ پہونچانا"۔ لیکن پرویز نے کچھ نہیں سُنا۔ کچھ نہیں سمجھا۔ کہ اُس کی طرف اشکبار نگاہوں سے یوں دیکھے گیا' جیسے وہ انسانی بے بسی بیان کر رہا ہو کہ ہم اب تمہیں نہیں روک سکتے۔ نہیں ٹھہرا سکتے۔ باچشمِ گریاں تمہیں رُخصت کرنا ہی پڑیگا اور تم ہم سے بچھڑ کر موت کے اندھیرے میں چلی جاؤ گی۔ تنِ تنہا۔ اکیلی! لیکن وہ بالکل خوفزدہ معلوم نہیں ہوتی تھی۔ اُس کے چہرے پر گھبراہٹ کے آثار قطعی نہیں تھے۔ البتہ اس کی نظروں میں ترس اُمنڈ آیا تھا اور وہ گویا بڑی بیچارگی سے کہہ رہی تھی۔ "پرویز ـــــ میرے پرویز! تم اپنا دل یوں میلا نہ کرو۔ مرد یوں نہیں رہتے ـــــ تمہیں میری جان کی قسم! میرے بعد تم ہمیشہ خوش خرم رہنا..... "۔ مگر وہ کہاں تک کہے جاتے؟ اشارے اور کنائے تو خود ستاروں کی طرح آنِ واحد میں گُم ہوتے ہیں۔ بس! بس! اس پر جانکنی طاری ہو گئی۔ اس کا تعلق دُنیا اور دُنیا والوں سے قطع ہو گیا۔ جانے دو، جانے دو اُسے، بلند، اور بلند، تاریکی اور نُور..... نُور اور تابی..... نہ جانے کہاں؟ ـــــ اور یہاں پہونچکر فسانہ نگار کا تخیل بھی عاجز ہے۔

رعنا کی موت سے پرویز کی زندگی نے ایک نئی کروٹ ضرور لے لی تھی۔ اُس کی جدائی سے اُسکے دل پر ایک گہرا داغ لگا تھا اور دُنیا اُس کی نظروں میں اندھیر ہو گئی تھی۔ لیکن وقت سب سے بڑا مرہم ہے۔ ہرے ہرے زخم مندمل ہو جاتے ہیں۔ ابتدائی کیفیت اسکی بھی جاتی رہی۔ البتہ کبھی کبھی مرحومہ کا خیال اُسے بُری طرح ستانے لگتا تھا جیسے اس کی عزیز تریں شے اُس سے چھن گئی ہے، اور وہ پہروں اس کی یاد میں کھو جاتا۔ اور جب اُس کی بے چینی حد سے بڑھ جاتی۔ اُسے کسی طرح قرار نہ آتا تو اُسے ایسا معلوم ہوتا کہ اسکی آنکھیں ہمت ہار بیٹھیں گی۔ ان میں آنسو چھلک آئیں گے، اور اس کا زخم پھر تازہ ہو جاتا۔

ایک دفعہ اُس کے دل میں آئی کہ اگر کسی طرح مجھ پر خود فراموشی طاری ہو جائے تو بہت اچھا ہو۔ یہ دُکھ کا احساس تو نہ رہے گا۔ یہ رُوح کی خلش تو نہ رہے گی۔ پر یہ خود فراموشی کیسے ہو؟ کیونکر وہ اپنے آپ کو بُھول جائے؟ اور یہ سوچتے سوچتے اُسے اوہنری کے فسانے ("A Ramble in Aphasia") کا خیال آ گیا۔ الوین بلفورڈ پر بھی تو بھول کی کیفیت طاری ہو گئی تھی۔ اُسے تو اپنا نام تک یاد نہ رہا۔ اپنے آپ کو ایڈورڈ، نیک ہیمر کہا کرتا تھا۔ لیکن نہیں۔ وہ تو بنتا تھا۔ اُس نے تو خود فراموشی کا ڈھونگ رچایا تھا۔ مگر اس کے دل نے کہا "کاش مجھے سچ مچ نسیان ہو جائے! میں اپنے وجود تک کو بُھول جاؤں۔ اپنی ہستی سے منکر ہو جاؤں۔ مجھے اپنے بیتے ہوئے حالات اور نام تک یاد نہ رہے......!" اور ابھی وہ یہ تمنّا کر رہا تھا کہ ذہن کے کسی چور دروازے سے یہ خیال اس کے سامنے ایک مجرم کی طرح آ کر کھڑا ہو گیا کہ "یہ اپنا دیس ہے پیارے!"

اُسے یہ خیال تک نہ رہا تھا کہ پرویز اور بلفورڈ کے ملکوں میں زمین آسمان کا

فرق ہے۔ وہاں پاگل خانے شفاخانے ہیں، یہاں شفاخانے بھی آزار خانے۔ وہاں خود فراموشی بھی تمسخر اور دل لگی کا ذریعہ بن سکتی ہے، یہاں درحقیقت کسی پر بیت جائے تو اُسے پاگل خانے میں ٹھونس دیا جاتا ہے۔ اور پھر ایکا ایکی، وہ اُن بدنصیبوں کا خیال کر کے کانپ اُٹھا جنہیں اُس نے چند مشہور شہروں میں "زیرِ علاج" دیکھا تھا۔ زیرِ علاج!؟ جیسے کسی نے خود اُس کی پیٹھ پر ہنٹر مارا ہو، وہ چونک پڑا اور اُسے یاد آیا کہ "دماغی معالج" اپنے "مریضوں کے فائدے کے لئے" مار پیٹ تک سے دریغ نہیں کرتے مزید برآں علاج کے نام سے جو جو اذیتیں اُن بے گناہوں کو پہونچائی جاتی ہیں، اُن کے تصور سے وہ لرزہ براندام ہو گیا، اور اُس نے توبہ کر لی "نہیں، نہیں۔ مجھے خود فراموشی نہیں چاہیئے۔ مجھے (Aphasia) نہیں چاہیئے۔ یہ بیماری ہندوستان کو زیب نہیں دیتی۔ یہاں تو یہ بھی آزار کا باعث ہو گی"

کم از کم ایک بات کا اُسے بڑا اطمینان تھا، اور وہ یہ کہ دانستہ اُس سے مرنے والی کو کبھی کوئی رنج نہیں پہونچا، اس کی کبھی کوئی حق تلفی نہیں ہوئی، اور اُس نے اُس پر کبھی کوئی زیادتی نہیں کی۔ بلکہ وہ ہمیشہ اُس کی قربانیوں کو سراہتا رہا، اُسکی خوبیوں کی داد دیتا رہا اور اُس کی والہانہ محبت کی قدر کرتا رہا۔ وہ بھی یہ سب کچھ جانتی تھی۔ پرویز کی فراخ دلی اور قدرشناسی کا اُسے اچھی طرح علم تھا۔ چنانچہ وہ اُس سے خوش گئی۔ اور یہ امر پرویز کے لئے باعثِ تسلّی تھا۔ شاید اسی لئے وہ اُسے خواب میں پریشان حال نہیں دکھائی دی اور نہ اس کے کسی خواب نے پرویز کو آزردہ خاطر کیا۔ بلکہ وہ ہمیشہ مطمئن نظر آتی اور اُس کا خواب ایک حکایتِ شیریں کی مانند دل پسند اور تشفّی آمیز ہوتا۔

پرویز کو اُس سے جو قلبی اور روحانی تعلق تھا اس کی بنا پر اس پر اب بھی کبھی

کبھی ناقابلِ بیان کیفیت طاری ہو جاتی تھی اور وہ ایسا محسوس کرتا کہ اُس کے بغیر وہ اس بھری پُری محفل میں بے سہارا اور تنِ تنہا ہے۔ اور یہ تنہائی، یہ اکیلاپن بعض اوقات اُسے اس قدر پُر اثر معلوم ہوتا کہ وہ اس سے گھبرا جاتا اور بے اختیار کہہ اُٹھتا "کہاں چلا جاؤں؟ کہاں نکل جاؤں؟ مجھے کہیں چین نہیں، کہیں سکون نہیں۔" اور اس وقت اُسے یہ محسوس ہوتا کہ اُس کی روح پرواز کر چکی ہے اور اب اس کا صرف جسم باقی رہ گیا ہے۔ اس کا ذہن اور احساسات فنا ہو گئے ہیں اور یہ جسم بھی کوئی دم میں شکستہ ہو جائے گا۔ اور پھر، اُس کے خیالات میں اُلجھن پیدا ہو جاتی "کیا وہ واقعی مر گئی ہے؟ ہمیشہ کے لئے جُدا ہو گئی ہے؟ کیا وہ اب کبھی اس دنیائے آب وگلِ میں واپس نہ آئے گی؟ اپنے گوشت پوست میں ظاہر نہ ہو گی؟ ....." اور وہ سوچنے لگتا "نہیں، نہیں۔ یہ حقیقت نہیں ہے۔ وہ ایک خواب تھا، دُنیا بھی ایک خواب ہے، اور ہم سب اُس کی پرچھائیاں ہیں۔ حقیقت اور دوام صرف اُن کو حاصل ہے جو ہماری نظروں سے پوشیدہ ہیں۔ ہم سب غیر حقیقی ہیں، مجازی ہیں، اُن حقیقتوں کے عکس ہیں۔ البتہ مرنے والے ہماری نظروں سے اوجھل ہو کر، ہمارے احساسات سے بالاتر ہو کر دوام و حقیقت میں مدغم ہو جاتے ہیں......" اور نہ جانے اس کے خیالات کہاں بھٹکنے لگتے، اور جب وہ اس پریشان خیالی سے چونکتا تو اس کے چہرے پر استغراق کے وہ گہرے نشانات پڑے ہوتے جو اذیت کوش تفکرات بطور نشانی اپنے پیچھے چھوڑ جاتے ہیں۔

——ایک دن جب وہ پھر اس کی یاد میں اچانک بے قرار ہو گیا تو وہ اُس سے ملنے چلی آئی۔ اُس نے دیکھا کہ وہ سپید اور نازک کپڑوں میں سرتاپا ملبوس اسکے قریب، مسہری پر بیٹھی ہوئی مسکرا رہی ہے۔ پرویز متحیّر رہ گیا۔ یہ خواب ہے یا اصلیت؟ بیداری اور روزِ روشن میں خواب تو نہیں دکھائی دیتے۔ ضرور میری وارفتگی اور کشش اُسے

بہشت سے کھینچ لائی ہے۔ بہرحال اس خوف سے کہ کہیں اسکی ذراسی حرکت یہ طلسم درہم برہم نہ کردے، وہ چپ چاپ اُسے دیکھتا رہا۔ یہ خواب بھی ہو تو اصلیت سے بہتر ہے کیونکہ اُس کے اس وجود میں زندگی کے تمام آثار تھے اور وہ اس سپنے کو کسی طرح ٹھیس نہیں لگانا چاہتا تھا۔

رعنا کے مسکراتے ہوئے لب غنچۂ ناشگفتہ کی طرح بند ہو گئے اور اُس نے ایسی آواز میں جو بہت دُور سے آرہی ہو، آہستہ آہستہ کہنا شروع کیا۔ "پرویز!.... تمہارا نالۂ فراق مجھے ہمیشہ تڑپاتا رہا۔ تمہاری خاموش محبت مجھے رُلاتی رہی۔ اور آج میں تم سے ایک بات کہنے چلی آئی ——" یہاں اس کا لہجہ غمناک ہو گیا —— "تمہیں یوں بےحال دیکھکر میں ہر وقت کڑھتی ہوں۔ ہائے مجھ سے یہ برداشت نہیں ہوتا کہ تم میری یاد میں یوں ہلکان ہو۔ اچھے پرویز! اپنی طبیعت کو سنبھالو! وہ تمہارا وہ لمن کہاں ہے؟ اور تمہیں سیر و سیاحت کا جو شوق تھا، تم اُسے پورا کیوں نہیں کرتے؟....."

یہ کہتے کہتے اُس کے نقوش، اس کی آواز کی طرح، دُھندلے ہوتے گئے۔ گویا اُسے جو بات کہنی تھی، وہ ختم ہو گئی ہے۔ اور دروازے کے پاس پہونچکر وہ سفید لباس اور نورانی شکل نظروں سے اوجھل ہو گئی۔

پرویز تڑپ کر کھڑا ہو گیا۔ "ذرا ٹھہرو۔ ذرا ٹھہرو۔ رعنا!..... رعنا!" وہ دروازے کی طرف لپکا مگر طلسم خیال ٹوٹ چکا تھا۔ خواب کی تاثیر ختم ہو گئی تھی۔ البتہ اس کی نگاہیں ابھی تک دروازے میں لٹکے ہوئے ریشمیں پردے پر جمی ہوئی تھیں جو اس طرح ہل کر ساکت ہو گیا تھا جیسے کوئی وہاں سے گذرا ہو۔ "نہیں!"..... وہ ازخود زیر لب کہنے لگا۔ "مجھے دھوکہ نہیں ہوا۔ میری آنکھوں نے فریب نہیں کھایا۔ رعنا بذاتِ خود میرے پاس آئی تھی، خود، بہ نفسِ نفیس۔ یہ اُسی کی مخصوص خوشبو ہے جو اُس کے اُجلے بدن اور اس کی دل پسند خوشبوؤں سے مل جل کر پیدا ہوتی تھی، ہاں، یہ ساری فضا اُسی خوشبو سے مہک رہی

ہے" اور وہ فضا میں اس طرح سانس لیتا ہوا ٹہلنے لگا جیسے وہ ساری خوشبو کو اپنے میں جذب کر لے گا..... "میری رعنا مجھے تسلی دینے آئی تھی۔ وہ اب بھی مجھے بچوں کی طرح مجھے سمجھاتی ہے۔ اُس نے مجھے سیاحت اور وائلن کی یاد دلائی ہے۔ واقعی مجھے وائلن بجائے ایک عرصہ گذر گیا ہے....." اور بہت دیر تک اُسے ایسا معلوم ہوتا رہا کہ رعنا ابھی ابھی اس کمرے سے گئی ہے بلکہ اُس کی آواز ابھی تک اُس کے کانوں میں گونج رہی ہے۔ پھر، آہستہ آہستہ اُس کی بے چینیاں اور بیقراریاں ماضی کے دُھندلکے میں تحلیل ہو گئیں اور اُسے ایسا محسوس ہوا کہ اس کی طبیعت ہلکی ہو گئی ہے اور اس کا دل اس ہلالِ نو کی مانند ہو گیا ہے جس میں ابھی تابانی اور درخشندگی آنے والی ہے اور جو اک دن بدرِ کامل بن کر چمکے گا۔

باب دوم :-

رقصِ شرر

پرویز نے سیاحت کے لئے بمبئی کو منتخب کیا جس کی تفریحوں اور سیر گاہوں کی اُس نے بارہا تعریف سُنی تھی۔ چنانچہ ضروری سامان کے ساتھ وہ ایک دن ہندوستان کے اس مشہور اور عظیم الشان شہر میں آ وارد ہوا جس کی ادائیں عروسانہ اور جلوے بے حجابانہ ہیں۔

کولابے میں، جو خاصے امیر لوگوں کا علاقہ ہے، اُس نے ایک شش منزلہ عمارت میں خوبصورت سا فلیٹ کرایہ پر لیا اور دن رات کا بیشتر حصّہ سیر و تفریح میں گذرنے لگا۔ وہاں کی ریت کے مطابق وہ ناشتہ اور کھانا عموماً ہوٹلوں میں کھایا کرتا تھا اور چونکہ بمبئی فاصلوں کا شہر ہے اس لئے کبھی ٹیکسی اور بجلی کی ریلوں میں اور کبھی بسوں اور وکٹوریہ میں آیا جایا کرتا تھا۔ اُس نے Cosmopolitan Cities کے متعلق جو کبھی کہیں سُنا یا پڑھا ہوگا، اس کا نقشہ اُس نے یہاں آکر دیکھا کہ ہر قسم کے آدمی، ہر قوم کے افراد، ہر ملک کے باشندے اور ہر مذہب کے پابند یہاں موجود ہیں۔ کیا ملکی اور کیا غیر ملکی، بلکہ خود ملکیوں میں بیسیوں مقاموں اور صوبوں کے لوگ بہ کثرت یہاں نظر آتے ہیں۔ اسی لئے کئی زبانیں اور کئی لباس رائج ہیں۔ البتہ ایک چیز بہر صورت مشترک ہے، وہ یہ کہ ایک کا مافی الضمیر دوسرا کسی نہ کسی طرح ضرور سمجھ لیتا ہے، نیز یہ

کہ ننگا کوئی نہیں پھرتا۔ یہاں کے رہنے والوں کی اُس نے ایک خصوصیت یہ دیکھی کہ وہ بہت تیز چلتے ہیں، اور اکثر کاروباری ذہنیت کے مالک ہیں۔ کہیں کا راستہ پوچھئے تو بجائے فاصلے کے، وقت کے پیمانے میں ناپ کر بتائیں گے۔ علاوہ ازیں یہاں ہر شخص دوسرے سے بے نیاز ہے۔ کسی کا پڑوسی کروڑپتی ہے تو کسی کو حسد یا جلن نہیں، اور اگر کوئی حاجتمند ہے تو کسی کو اس سے ہمدردی نہیں۔

یہاں ہوٹل بے شمار ہیں اور بعض جگہ کھانے کا یہ اہتمام ہے کہ ایک ہی پتیلے میں بیسیوں قسم کے سالن پکائے جاتے ہیں۔ مزید برآں بعض ہوٹلوں کے نام بڑے پُرلطف ہیں مثلاً ایک ہوٹل کا نام تھا "بسم اللہ ہوٹل"۔ دوسرے کا "الحمد للہ ہوٹل"۔ اسکے برابر ایک اور ہوٹل کا نام تھا "قل ہو اللہ ہوٹل"۔ اور اُس نے سوچا کہ شاید کسی ہوٹل کا نام "انا للہ.... ہوٹل" بھی ہو۔ اسی طرح چند دلچسپ نام انسانوں کے بھی نظر آئے۔ ایک جگہ لکھا تھا "قاضی شہر وصی جان لونڈرے"۔ کسی فلیٹ پر دو صاحبوں کے نام کی تختیاں لگی ہوئی تھیں۔ ایک پر پینٹ کیا ہوا تھا "سیٹھ خلیل احمد کٹکھٹے"۔ اور دوسرے پر "فرخ حاجی محمد شوجی اللہ رکھا عزیز احمد بندوق والا"۔ ثانی الذکر نام کی ہیئت عجیب تھی اور معلوم کرنے پر اُسے کسی نے بتایا کہ یہ ایک ہی شخص کا نام ہے لیکن شوجی کا شیوا جی سے کوئی تعلق نہیں ہے جیسے یہ صاحب خود نہ حاجی ہیں اور نہ بندوق والے بلکہ یہ سب اُن کے نام کے اجزا ہیں جو اُن کے باپ دادا کے ناموں سے مل کر بنا ہے، اور اُس کے دل میں آپ ہی آپ یہ خیال پیدا ہوا کہ آخر ہماری طرف اس قدر دلچسپ نام کیوں نہیں رکھے جاتے؟

یہاں کی عبادت گاہیں اُسے اس شہر کی عظمت کا اہم جزو معلوم ہوئیں، خصوصاً ایرانیوں کے آتشکدے اور مسلمانوں کی مسجدیں، آتش گاہوں کے متعلق اُس نے یہ روایت سُنی کہ وہاں اب تک وہی آگ روشن ہے جو ابتداءً حضرت زرتشت نے جلائی

تھی۔ ان آتش کدوں میں اُسے سب سے زیادہ اُس پرستش گاہ نے متاثر کیا جو فورٹ کے علاقے میں واقع ہے اور جس کا بیرونی حصہ دو عظیم و جسیم سنگی گھوڑوں کے سروں پر قائم ہے۔ ان گھوڑوں کے بازوؤں میں اُڑنے والے پر ہیں۔ ان کی گردنیں اور چہرے انسانی ہیں اور اُن کی زلفیں دراز اور گھنگریالی ہیں۔ اس معبد کی شہ نشیں میں دو پجاری پگڑی نما ٹوپیاں اوڑھے، اور سادے چُغے پہنے، شاید کوئی مذہبی رسم ادا کرتے رہتے ہیں اور اُنکے قریب خوشبودار لکڑیاں رکھی رہتی ہیں۔ اُس کا اِسے اندر سے دیکھنے کو بہت جی چاہا کیونکہ اُس نے سُنا تھا کہ یہ کنشت دوسری پرستشگاہوں سے جُدا ہے اور اُس کی فضا بھی حد درجہ عجیب و غریب ہے مگر یہ معلوم کر کے اُسے بڑی مایوسی ہوئی کہ اُس کے اندر جانے کی سوائے آتش پرستوں کے کسی کو اجازت نہیں ہے ـــــ مسلمانوں کی مسجدیں جتنی خوبصورت اور جس کثرت سے یہاں ہیں بہت کم شہروں میں ہونگی۔ اُن کی تعمیر اور آرائش میں دل کھول کر روپیہ خرچ کیا گیا ہے لیکن بعض مسجدوں کے متعلق معلوم ہوا کہ وہ صرف چند فرقوں کے لئے مخصوص ہیں اور ان میں داخلہ عام نہیں ہے۔ اس پر پرویز کو بڑی حیرت ہوئی کہ کم از کم یہ ایک ایسا شہر ہے جہاں مسجد خدا کا گھر ہوتے ہوتے بھی اپنے ایک وصف سے محروم ہے یعنی یہ کہ اُس کے در ہر مومن کے لئے کھلے ہوئے نہیں ہیں۔

اُس نے وہاں کی مشہور تفریح گاہوں اور جیال افروز مقامات کی خوب سیریں کیں۔ چوڑے چوڑے کھلے بازاروں کے ساتھ ساتھ تنگ و تار گلیوں کا بھی مطالعہ کیا۔ امیروں کے قہقہوں میں غریبوں کی آہوں کو بھی ڈوبتے ہوتے دیکھا۔ نور کی کرنوں میں ظلمات کی چھینٹیں بھی چھپتی دیکھیں۔ اُن علاقوں میں بھی پھرا جہاں دولتمند نے سربفلک اور بیش قیمت محل کھڑے کر رکھے ہیں، اور اُن مقامات پر بھی نظر کی جہاں غربا نے ملکر اپنی گندی اور تاریک بستیاں بنائی ہیں۔ ملابار ہل کے سبزہ زاروں اور میرین ڈرائیو کے خوابستانوں میں اُس نے حسین سے حسین تر اور آرام دہ عمارتوں سے بھی نگاہ کو

آسودہ کیا اور باندرہ قسم کی آبادیوں سے بھی اپنے حساس قلب کو ٹھیس لگائی جس کی ہوا مستقل طور پر ناقابلِ برداشت تعفّن سے لبریز ہے۔ لیکن فراغت اور فلاکت، دولت اور افلاس، عظمت اور پستی کے اس پُر جوش تصادم، اس زبردست ٹکر، اور اس بے پناہ پیکار سے متاثر ہوکر وہ پریشان نہیں ہوا، بلکہ وہ قدرت کی ان ستم ظریفیوں اور تقدیر کی اِن متعصب حمایتوں کا استقلال سے مطالعہ کرتا رہا اور وہ سوچنے لگا کہ بمبئی تو ایک ضخیم کتاب ہے جس کا مطالعہ، پڑھنے والے کو انسان کی فطرت اور قدرت کی طاقت سے بے حد قریب کر دیتا ہے! کوئی آئے اور اُسے پڑھے، کہ اس میں ہر عنوان پر ایک دلچسپ مضمون موجود ہے۔

پرویز کو یہ بات بڑی عجیب معلوم ہوئی کہ یہاں ہر شخص بلا تمیز مذہب و ملّت اور بلا لحاظ امیری و غریبی سیٹھ کہلاتا ہے۔ امیر کو سیٹھ کہنا تو خیر تعجب انگیز نہیں کہ وہ فی الواقع دولتمند ہے۔ یہ اور بات ہے کہ وہ پیشے کے لحاظ سے بھی سیٹھ ہے یا نہیں۔ لیکن غریب اور محتاج کو سیٹھ کہنے کے دو ہی مقصد ہوسکتے ہیں۔ ایک یہ کہ وہ بھی اپنے کو سر بلند اور مغرور سمجھے۔ اُسے بھی اپنے پندار اور عزتِ نفس کا احساس رہے، اور چاہے وہ مالی اعتبار سے غریب ہو، لیکن ذہنی اعتبار سے اپنی نظروں سے کبھی نہ گرے۔ اگر ایسا ہے تو کیا کہنے! اخلاقیات کی تعلیم کا یہ طریقہ تو شاید حکماءِ یونان کے تصوّر میں بھی نہ ہوگا۔ دوسرا مقصد یہ ہوسکتا ہے کہ دشمن اپنے مخاطب کو سیٹھ کہکر اُسے اس کی مفلسی یاد دلا رہا ہے، بالفاظِ دیگر اُسے غریبی کا طعنہ دے رہا ہے۔ خیر، پرویز سوچنے لگا، مجھے اس سے بحث نہیں۔ میں تو یہ دیکھتا ہوں کہ یہاں ہر پیشے کے لوگ ملتے ہیں۔ سرمایہ دار، ملوں کے مزدور، ان کے لیڈر، تاجر، نوکر پیشہ، دفتروں کے بابو، سٹے باز، ریس کے شوقین، فلم کمپنیوں کے مالک، ایکٹرز اور ایکٹرسیں! غرض ہر طبقے کے وہ افراد یہاں موجود ہیں جو آج کل کے "ترقی پسند" ادیبوں کا موضوع بنے ہوئے ہیں۔۔۔۔۔۔ اور جونہی اُسے ایکٹرسیں یاد

آئیں، خیال وہیں کے وہیں رُک کر ایک دوسری راہ پر ہو لیا، اور تمام اثرات و نقوش جو یہاں کی عورتوں کے متعلق اس کی سطح ذہن پر مرتسم ہوئے تھے، تصویروں کی طرح اسکے سامنے متحرک ہونے لگے۔

بے نقاب اور عشوہ طراز عورتوں کی یہاں کثرت ہے۔ جگہ جگہ اینگلو انڈین اور غیر ملکی میمیں، اور اُن کے ساتھ اُن کی ریس کرنے والی کالی "میم صاحبنیں" منتظر التفات نظر آتی ہیں، گویا کسی جابکدست مصور نے روشنی اور سائے کا دلچسپ امتزاج تجویز کیا ہے۔ ان کے علاوہ یہاں یہودی اور مرہٹہ لڑکیاں ہیں جن کی چھاتیاں شباب کے زور سے تنی ہوئی اور جن کی بھری بھری پنڈلیاں جوانی کے جوش سے بل کھاتی ہوئی معلوم ہوتی ہیں۔ اس حُسنِ بے محابا کے سیلاب میں وہ پارسی عورتیں بھی نظر آتی ہیں جن کا بدن ساڑھی میں چھپا رہتا ہے اور جو بازاروں میں شمالی ہند کی نیک اور باحیا خواتین کی طرح باحیا اور بچکر چلتی ہیں۔ پھر یہاں ہر طبقے کی نسوانیت موجود ہے۔ وہ بھی، جس سے زنانِ بازاری کی زندگی اور تابندگی عبارت ہے، اور وہ بھی، جس سے گھروں کے چراغ روشن ہیں۔ اوّل الذکر چپے چپے پر، ثانی الذکر کہیں کہیں۔ ان میں بعض عورتیں ایسی ہیں جو گھروں کی بیٹھنے والی اور فی الواقع چراغِ خانہ ہیں، لیکن اکثر وہ ہیں جو زینت محفل اور آرائشِ بزم ہیں۔ کچھ ایسی بھی ہیں جو مجبوراً دکانوں میں شوپ گرلز یا دفتروں میں ٹائپسٹ، اسٹینو گرافرز اور سکرٹیریز کے فرائض انجام دیتی ہیں تاکہ اس آمدنی سے اپنے معذور والدین اور چھوٹے بہن بھائیوں کی پرورش کر سکیں۔ ایک کثیر تعداد اُن لڑکیوں کی ہے جو اپنے حسن و جوانی کی باقاعدہ تجارت کرتی ہیں لیکن بازاروں میں بیٹھ کر نہیں۔ بلکہ نئے تمدن اور نئی تہذیب کے نئے فیشن کے مطابق "شریکِ شب" بنکر جس میں شام کی سیر اور رات کا کھانا بھی شامل ہے۔ دوسرا گروہ اُن عورتوں کا ہے جن کا حُسن سرِ راہ اور جن کی آغوش ہر شخص کے لئے وا رہتی ہے۔ اور حسن کی یہ راہیں بے شمار علاقوں اور بستیوں

ہیں سے ہوکر گذرتی ہیں۔ ان منزلوں میں دُور دراز سے لاتی ہوئی قندیلیں روشن ہیں۔ ان انجمنوں میں نہ صرف ہندوستان بلکہ فرنگستان کی شمعیں بھی منوّر ہیں۔ ان میں ایسی کم ہیں جو رقص و موسیقی سے محظوظ کر سکیں۔ زیادہ تعداد اُن کی ہے جنہیں کم سے کم وقت میں زیادہ سے زیادہ لوگوں کی تسکین منظور ہے۔ یعنی خوش وقتی و خوش باشی نہیں، صرف روپیہ درکار ہے۔ ایک اور قسم یہاں اُن حُسن فروشوں کی ہے جو ایکٹرسیں کہلاتی ہیں۔ فلموں کے ذریعہ اُن کی شہرت دُور دُور تک پھیلی ہوئی ہے اور بہت سے دل پھینک نوجوان اُن کے حُسنِ ظاہری (Screen Beauty) اور اصلی اور کسی اور کی صدابندی کئے ہوئے گانوں سے اس قدر متاثر ہوئے ہیں کہ اُن کی خاطر گھر بار چھوڑ کر آ گئے ہیں۔ وہ اُن کے گھروں کا طواف کرتے ہیں۔ کسی کسی کی رسائی بھی ہو جاتی ہے مگر اکثر و بیشتر ناکام و نامراد رہتے ہیں کیونکہ یہ ایکٹرسیں انہیں اپنی حیثیت کا نہ پاکر انہیں مُنہ نہیں لگاتیں۔ شہرت اور تعریفوں نے اِنہیں تکبر اور بیوقوفی کے قلعے پر جو بٹھا دیا ہے! دولت اور لالچ نے اُن کے دلوں کو پتھر کے ٹکڑوں میں تبدیل کر دیا ہے!

علاوہ ازیں یہاں وہ کوکنی اور مالاباری غریب عورتیں بھی ہیں جو کہیں کہیں سڑک کے کنارے اُبلی ہوئی پھلیاں، چٹ پٹے چنے یا کیلے اور امرود بیچتی ہوئی نظر آتی ہیں۔ مفلسی اور رواج کے مطابق اُن کے پیٹ اور ٹانگیں کچھ ڈھکی اور کچھ کھلی ہوئی ہوتی ہیں اور اس نے دیکھا کہ وکٹوریہ اور ٹیکسی والے ان سے سودا خریدتے وقت چھیڑ چھاڑ بھی کر لیتے ہیں۔ کوئی سُن کر پی جاتی ہے، کوئی اپنی بولی میں جھڑک دیتی ہے اور کوئی آنکھوں آنکھوں میں راضی بھی ہو جاتی ہے۔ اور اسی رضامندی کے نظارے نے اُسے کنارِ آب جو پاٹی و گلگشتِ اپولو یاد دلا دیا جہاں اُس نے رضامند جوڑوں کو جوانی کے نشے میں سرشار دیکھ کر بہت لطف اُٹھایا تھا اور صرف ایک دفعہ چند بحالت

کے لئے اُس کے دل میں بھی یہ خیال پناہ گزیں ہو گیا تھا کہ ع:۔

زندگی شاید اسی کا نام ہے

اور یہ سوچتے سوچتے اُس کے ذہن میں وہ گجراتن اُبھر آئی جو نچلی منزل میں اُسے آتے جاتے عجیب عجیب نظروں سے دیکھا کرتی تھی۔

سہ پہر کے قریب پرویز اپنی قیام گاہ پر واپس آیا تو زینے پر چڑھتے ہوئے اُس فلیٹ کے سامنے سے گذرا جس میں وہ گجرات کی دوشیزہ رہا کرتی تھی۔ اُس نے دیکھا کہ دروازے کا ایک پٹ کھلا ہوا ہے، اور وہ رہزنِ تمکین و ہوش، لوہے کے اسپرنگ دار پلنگ پر عجب اندازِ دلربائی سے لیٹی ہوئی ہے۔ اور عین اُس لمحے جب پرویز کی نظریں، بلا کسی قصد کے، اُس کی تکیوں کے سہارے ٹکی ہوئی نیم عریاں کمر پر پڑیں، اُس گجراتن نے اُسے دیکھ لیا۔ اور پھر جب ایک ثانیہ کے لئے اُن دونوں کی نگاہیں چار ہوئیں تو وہ پارۂ برق کی مانند اس انداز سے اُٹھ کر بیٹھ گئی گویا اُسے اندر آنے کی دعوت دے رہی ہو۔ اور ایکا ایکی اُس نے اپنے رس بھرے ہونٹوں کو جو جوانی کی دمک سے گلنار ہو رہے تھے، اس طرح جنبش دی جیسے شباب سے لبریز لب اس وقت حرکت کرتے ہیں، جب اُن پر نہایت جوشیلے اور والہانہ طور پر مُہرِ محبت ثبت کی جائے ——— لیکن پرویز نے یہ سب کچھ نظر انداز کر دیا، اور ان اشاروں کے متعلق جو وقت کے کم سے کم حصّے میں کئے گئے تھے، کوئی خیال آرائی کئے بغیر، وہ چشم زدن میں اپنے فلیٹ کی سیڑھیوں کی طرف مڑ گیا۔ اور جونہی وہ اوپر چڑھا اُس نے نچلی منزل میں دروازے کے بہت زور سے بند ہونے کی آواز سنی۔

یہ وہی گجراتن تھی جس نے جھنجلا کر دروازہ بند کیا تھا۔ دراصل پرویز کے اس طرح چلے جانے سے اُس کے پندارِ شباب کو ٹھیس لگی تھی اور اس کی اِس بے رخی نے اُسے

ضد اور خلجان میں مبتلا کر دیا تھا۔ ویسے بھی اُسے اس بات کی بڑی خلش تھی کہ اس خوبرو نووارد دلنے، اس بانکے نوجوان نے، آج تک اس کی بارگاہِ حسن میں اپنا خراج بیقراری ادا نہیں کیا۔ اس سے اس درجہ بے نیازی! اور آج اس کی دعوت شوق کی اس قدر بے قدری! اس کا پیمانۂ صبر لبریز ہو گیا۔ مگر وہ کیا کر لیتی؟ کیا کر سکتی تھی؟ اس نووارد اور اجنبی نوجوان پر اس کا بس ہی کیا تھا؟ آپ ہی آپ پیچ و تاب کھا کر رہ گئی۔

اس کا باپ کسی دفتر میں چیف کلرک تھا۔ اُس کی پنشن کے دن قریب آ رہے تھے اس لئے عمر کے تقاضے کے مطابق بجائے آرام کرنے کے، اس کی دفتری ذمہ داریاں بڑھ گئی تھیں۔ لاکھ کوشش کرتا مگر بچارے کو گھر پہونچتے پہونچتے ہمیشہ شام ہو جاتی تھی۔ اور گھر میں اُس کی بس یہی ایک بیٹی تھی۔ اس کے بیاہ کا معاملہ سورت میں کہیں طے پا رہا تھا، مگر فی الحال اُسے یہ پہاڑ سے دن اکیلے کاٹنے پڑتے تھے، بہت سے بہت وہ کبھی کبھار اپنے پرانے خدمتگار سے ہنس بول لیتی تھی، جو بے وقوف اور اترتی آندھی کا راہی ہو چلا تھا۔ اس کا باپ ہمیشہ سے خسیس تھا اور کچھ ایسی ہی عادت اُس کی بیوی میں بھی تھی جو مرتے مر گئی مگر اُس نے اپنے علاج پر زیادہ خرچ نہ ہونے دیا۔ لیکن اس تمام کنجوسی کی کسر اس کی لڑکی نے نکال دی تھی، جسے مر اُٹھے اپنی دولت سے زیادہ چاہتا تھا۔ لہذا اگرچہ خود اُس کا خرچ بہت معمولی تھا مگر اُس کی لڑکی اپنے کھانے پینے اور پہننے اوڑھنے میں بے دریغ روپیہ صرف کرتی تھی۔ اس کے علاوہ اُسے بے فکری بھی میسر تھی جس کے برابر کوئی نعمت نہیں۔ چنانچہ اس کی جوانی حسن کی چھاؤں میں اس طرح جوشِ و خروش سے آئی جیسے املی کی گھنی شاخیں جوشِ نمو میں دُور دُور تک چھا جاتی ہیں۔ اس کے گھر میں کوئی بڑی بوڑھی نہیں تھی جو اُسکی محافظ اور سنسر ہوتی، اس لئے اُسے باپ کی عدم موجودگی میں غیر نوجوانوں سے دل بہلانے کے اکثر مواقع ملتے رہے۔ اس کا ملازم اس کا ہمراز اور اشاروں پر چلنے والا تھا۔ لہذا وہ جب صاحبِ دل سے ملنا چاہتی

اُس کے توسط سے وہ اُسے اپنے ہاں بلا لیتی تھی، اُسے کسی سے کوئی مالی لالچ نہ تھا، بلکہ یونہی، ذرا خوش وقتی کے لئے، اُسے اپنے ہم عمر نوجوانوں کی خلوت میں بڑا سرور اور امتنان محسوس ہوتا تھا۔ چونکہ وہ حسین اور جوانی سے بھرپور تھی، اس کا انتخاب عموماً کامیاب ہوتا اور نوجوان ـــــ بمبئی کا نوجوان ـــــ مکھی کی طرح تارِ عنکبوت میں آسانی سے زیرِ دام آجاتا تھا...... اس قسم کی ملاقاتوں نے اس کی جھجک مٹا دی۔ اس کے حوصلے بڑھا دیے اور وہ سمجھنے لگی کہ وہ جس کی طرف ذرا بھی نظر اٹھا کر دیکھے گی، وہ خود بخود اس کی طرف کھنچ آئے گا اور اس کے شباب کی مقناطیسی کشش کے آگے ہتھیار ڈال دیگا۔

لیکن اس دفعہ ایسا نہیں ہوا۔ یہ اُوپر کی منزل میں جو کبرو نوجوان رہتا ہے، اُس نے اس کی طرف پُر اشتیاق نظروں سے کبھی نہیں دیکھا بلکہ ـــــ بلکہ اُس نے اس کی دعوتِ شوق کو بھی قبول نہیں کیا۔ اشارے پر بھی پروانہ وار اندر نہیں چلا آیا۔ اور اس خیال سے اس کے سینے میں زیر و بم ہونے لگا۔ کتنی توہین کردی ہے، اس مغرور لڑکے نے! اسی لئے جب وہ اپنے فلیٹ کی سیڑھیوں پر چڑھ گیا تو اس گجراتن کا صرف اتنا بس چل سکا کہ غصے میں اپنا ہی دروازہ بند کرلے۔ اس کے علاوہ یہ جھنجلاہٹ اور اُتاری بھی کیسے جاسکتی تھی؟۔

آہستہ آہستہ اُس کا شعلۂ غضب سرد پڑ گیا اور اُس نے اپنے دل میں سوچا شاید یہ نوجوان بمبئی میں بالکل نیا ہے۔ کہیں باہر سے آیا ہے۔ اس میں ہمت نہیں ہوئی ...... اور اس خیال کے آتے ہی اُس نے رسوئی میں جاکر اپنے خدمتگار کو آواز دی۔

دروازے پر دستک سُن کر پرویز نے اُسے اندر بلا لیا۔ یہ گجراتن کا ملازم تھا۔ کہنے

لگا "سٹھانی جی آپ کو بلاتی ہیں"
"کون سٹھانی ؟" پرویز نے اُسے تعجب سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔
ملازم بولا "وہ جو نیچے کی منزل میں رہتی ہیں۔ زینے کے سامنے والے فلیٹ میں"
معاً پرویز کی آنکھوں کے سامنے وہ منظر آگیا، جو کچھ دیر ہوئی اُس نے نچلی منزل میں دیکھا تھا۔ اُس گجراتن کے معنی خیز تبسم، اور لبوں کی جنبش، نقشِ تازہ بن کر اس کے ذہن میں واضح ہو گئے، اور اُس نے حیرت سے کہا "میں تو اُنہیں نہیں جانتا — اُنہوں نے مجھے کیوں بُلایا ہے؟"
ملازم مسکرایا "یہ آپ اُن سے چلکر پوچھ لیجئے نا!"
"نہیں —" پرویز نے لاپرواہی سے جواب دیا "میں یہاں کسی سے واقف نہیں اور نہ کسی سے ملنا چاہتا ہوں" یہ کہکر اُس نے اپنا وائلن اُٹھالیا اور تاروں کو ہم آہنگ کرنے کے لئے اُنکے پیچوں کو کسنے لگا۔
ملازم کو گئے ہوئے کوئی آدھا گھنٹہ گذرا ہوگا کہ پھر کسی نے دروازے پر دستک دی۔ پرویز نے کھٹکا کھول دیا اور اس دفعہ اُس نے دیکھا کہ وہی گجراتن سولہ سنگھار کئے اپنے جلو میں حسن و شباب کی بیشمار ادائیں لئے، بے جھجک اور اس انداز سے آئی ہی جیسے اُسے یہاں کوئی تکلف نہیں۔ کوئی غیریت نہیں۔
پرویز چند لمحات اُسے استعجاب سے دیکھتا رہا اور پھر اخلاقاً اُسے اپنے مقابل والے صوفے پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ اور جب وہ بصد ناز و انداز وہاں تشریف فرما ہو گئی تو وہ خود، وائلن اور اُسکے گز کو کیس میں رکھنے لگا۔
گجراتن نے محسوس کر لیا کہ یہ شخص، جس کا رواں رواں شباب اور صحت سے دمک رہا ہے، میری طرف متوجہ نہیں، شاید وہ وائلن کے بہانے وقت ضائع کر رہا ہے۔ آخر، اُس نے مسکرا کر کہا "ذرا میری طرف دیکھئے" اور یہ اُس نے اِس لب و لہجے میں کہا

جس میں نرمی اور شگفتگی کے علاوہ مخاطب کو اپنے طرف منعطف کرنے کی قوت پوشیدہ تھی،
پرویز نے نظر اونچی کی اور دیکھا کہ گجراتن کی سیاہ اور چمکیلی آنکھیں اس پر اس طرح جمی
ہوئی ہیں جیسے وہ کوئی جادوگرنی ہیں اور اس کی بے پناہ نظر اسے آناً فاناً مسحور
کرلے گی۔ اپنے قابو میں کرلے گی اور وہ کسی معمولِ سحر کی مانند بالکل اسکے بس
میں ہوجائے گا۔

پرویز نے اُس کا سرتاپا جائزہ لیا۔ وہ خوبصورت ہے، جوان ہے، اور اسقدر،
گویا جوانی کا سورج حُسن کی انتہائی لطافتوں کے ساتھ نصف النہار پر پہونچا ہوا ہے۔
اُس نے اُس کی کُشادہ پیشانی کو دیکھا جس پر سُرخ چندن کی بندی لگی ہوئی تھی جیسے
کسی عاشق کا دل خون ہوکر اُس ایک قطرے میں سمٹ گیا ہو۔ پھر اُس نے اس کے چمپئی
بازوؤں اور باہوں کو دیکھا جن میں جذبات کی شعاعیں، اُبھرتے ہوئے آفتاب کی طرح
مچل رہی تھیں۔ اس کے سینے کا سامنے کا حصّہ کھُلا ہوا تھا، جیسے اُس نے اجازتِ عام
دے رکھی ہے کہ اس سرچشمہ حُسن سے نگہ شباب اپنی بیتابیاں حاصل کرلے۔ اسکی
ساڑھی گجرات کی مخصوص بندش کے مطابق اس طرح بندھی ہوئی تھی کہ اس کی
پنڈلیوں کا بالائی حصّہ برہنہ نظر آرہا تھا، اور ان پنڈلیوں پر خفیف سُنہری روئیں گی
اس طرح دمک رہی تھی جیسے کسی منوّر جسم میں سے ہلکی ہلکی شعاعیں نکل رہی ہیں۔

گجراتن بولی: "میرا نام نشی ہے۔ میں تیسرے مالے میں رہتی ہوں۔" یہ کہہ کر وہ
ذرا آگے جھکی اور اُس نے پرویز کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا گویا وہ مصافحہ کرنا چاہتی ہے
مگر اُس نے اُس کا ہاتھ پھر نہیں چھوڑا، اور بولی: "میں آپ کو کئی دن سے دیکھ رہی
ہوں...... آپ نے مجھے رام کرلیا ہے۔"

نشی نے اپنے دوسرے ہاتھ کی بھی مٹھی بنالی ہے اور اپنے دونوں ہاتھوں
میں پرویز کا ہاتھ اس مضبوطی سے پکڑ لیا جیسے کسی نوآموز شکاری کو ڈر ہو کہ اُس کا

لو گرفتہ پنچھی ذرا ڈھیل ملنے پر اُڑ جائے گا۔ اُس کے ہاتھ چل رہے تھے اور اُس کی آنکھوں کی سیاہ چمک سے اس کی جوشیلی طبیعت کا اظہار ہو رہا تھا۔ اور اُس ایک لمحے کے لئے ابلیس پرویز کے کانوں میں اپنا نغمۂ شباب سُنانے لگا کہ اس میں کوئی ہرج نہیں۔ کوئی مضائقہ نہیں! آخر تم مرد ہو، جوان ہو! بمبئی کے عشرت کدے میں جہاں حُسن و شباب کی شمعیں از خود فروزاں ہوتی ہیں، ایک بار، صرف ایک بار، عیش و طرب کا لُطف اُٹھانے میں، ایسا کونسا نقصان ہو جائیگا؟ ایسا کونسا ستم ہو جائیگا؟

——— اور جونہی وہ نشی کے کھینچنے پر اس کے پاس صوفے پر جا کر بیٹھنے والا تھا اس کی نظر نشی کے پاؤں پر پڑی جو بے دھیانی میں چپّل سے نکل کر دوسرے پاؤں پر آ ٹکا تھا۔ اور اسے دیکھکر اُسے اپنی مرحومہ بیوی کا پاؤں یاد آ گیا جس کی ساخت اور رنگت اِس سے بہت ملتی جُلتی تھی، اور اچانک کسی نے اُس نغمۂ شیطانی کو منتشر کرتے ہوئے، ٹھہر ٹھہر کر، کہا: "سنبھل اے دل! سنبھل! یہاں جبیں نہ جھکانا۔ یوں سرِ نیاز خم نہ کرنا۔ یہ سجدۂ شوق روا نہیں۔"

پرویز نے ایکا ایکی اپنا ہاتھ کھینچ لیا اور فیصلہ کُن آواز میں بولا: "جی نہیں! مجھے معاف کیجئے ......" اور یہ کہتے کہتے وہ رُک گیا، کیونکہ نشی غصّے میں کھڑی ہو گئی تھی۔ اس کا غیظ و غضب شعلے کی طرح بھڑک اُٹھا تھا اور اس وقت وہ اُس بوالہوس سلومی کی مانند معلوم ہوتی تھی جو یوحنّاں کے انکار پر برافروختہ ہو گئی تھی۔ اسکی جان کے درپے ہو گئی تھی اور صرف اس لئے ——— اس لئے کہ اس پرہیزگار پیغمبر نے اُسے اپنے لب چومنے کی اجازت نہیں دی، وہ اس کا سر کٹوا کر رہی۔

پرویز اپنے پریشان خیالات کو یکسو کرنے کیلئے باہر نکل آیا اور میرین ڈرائیو کی اس طویل اور چکنی دیوار پر آ کر بیٹھ گیا جس کے دامن میں سمندر کی موجیں آ آ کر ٹکراتی ہیں۔

اس دیوار کے پاس، فٹ پاتھ اور اس کے آگے چوڑی چوڑی سڑکیں تھیں جن کے بیچوں بیچ مختصر سے سر سبز قطعے تھے۔ اور ان قطعات میں ایک سرے سے دوسرے سرے تک گیس سے جلنے والی تیز اور خوبصورت لالٹینیں آویزاں تھیں۔ سڑکوں کے دوسری جانب وہ بڑے بڑے قصر نما مکانات تھے جن میں بہت بڑے رئیس یا بہت بڑی ایکٹرسیں رہا کرتی ہیں۔ ان مکانات کا سلسلہ تا حدِ نظر پھیلتا چلا گیا تھا اور دُور سے یہ ایک ہی خاکے اور ڈیزائن کے ہوادار محلات، کھلونوں کی مانند نازک اور بھلے معلوم ہوتے تھے۔

پرویز نے بمبئی کے اس نمائشی اُجلے رُخ کی طرف سے اپنا منہ پھیر لیا، اور اس کا خیال اس مشہورِ عالم شہر کی تاریکیوں میں منڈلانے لگا جہاں گناہ، حسن اور شباب کے سہارے طرح طرح کے روپ بھرتا ہے۔ اس کی نظریں سطحِ آب پر مسافت طے کرتی ہوئی دُور، بہت دُور چلی گئیں، اور آپ ہی آپ سمندر اور شام کے اس حسین سنجوگ نے اُسے یاد دلایا کہ اس وسیع و عریض بحیرہ نما کے قرب میں جزیرے بھی تو ہیں۔ بمبئی کے گرد و نواح میں گھاٹیاں اور وادیاں بھی تو ہیں۔ شاید وہاں میری رُوح کو زیادہ آسودگی نصیب ہوگی۔ زیادہ سکون ملے گا۔ اور جب اچانک ساغرِ آفتاب کی گردش پوری ہو گئی اور ساقیِ قدرت نے اُسے مئے ظلمات سے لبریز کر کے خمخانۂ مغرب میں لُنڈھا دیا تو پرویز ایک عزمِ مستقل کے ساتھ اُٹھ کھڑا ہوا۔ اُس نے فیصلہ کر لیا کہ وہ نشّی کی زد، اور بمبئی کی زہد شکن فضا سے بچنے کیلئے کل ہی یہاں سے چلا جائیگا اور اُن جزیروں میں سکون تلاش کریگا جو اسکے آس پاس ہیں مگر بمبئی کی آلودگیوں سے یقیناً محفوظ ہونگے۔

باب سوم

نغمانہ

پہلے اُس نے اُن جزیروں کی سیاحت کی جو زیادہ معروف تھے اور جہاں مسافروں کو اسٹیمر لے جاتا تھا۔ ایلی فینٹا، مروڈ، آرن اور جبشاں کے پُر فضا جنگلوں، لہلہاتی گھاٹیوں اور ہرے بھرے میدانوں سے وہ بیحد محظوظ ہوا۔ یہاں کی خوبصورتی واقعی رُوح کی ترو تازگی کا باعث تھی اور وہ شخص اس سے زیادہ لُطف اندوز ہو سکتا تھا جو خوب چل سکتا ہو۔ میلوں پیدل پھر سکتا ہو۔ ورجسے قدرت کے غیر مادّی حُسن سے دلی مناسبت ہو۔ پرویز کی رگوں میں جوان خون موجزن تھا اور وہ بہت دُور دور تک ٹہلتا ہوا چلا جاتا تھا۔ اُسے یہ جزیرے بڑے پسند آئے اور اُس نے محسوس کیا کہ تنہائی پسند اور الم رسیدہ طبیعتوں کے لئے دُنیا میں ان سے بہتر کوئی جگہ نہیں ہے۔ ان کی سیر کے بعد اُس نے اُن چھوٹے چھوٹے جزیروں کا رُخ کیا جن کے لئے بادبانی کشتی میں بھی سفر کیا جا سکتا تھا اور اس طرح عرصہ دراز تک وہ ایک جزیرے سے دوسرے جزیرے میں، ایک وادی سے دوسری وادی میں پہونچتا رہا۔ لیکن اس کی طبیعت کبھی سیراب نہیں ہوئی اور ہر نئی جگہ پہونچکر اس کا دل یہی چاہا کہ یہ سفر جاری رہے۔ صبح سے شام تک، زندگی کے اختتام تک، یونہی چلتا رہوں۔ قدرت مجھے بھی اپنا ایک حقیر سا ذرّہ سمجھ لے اور مجھے وہ سرمدی اور انوکھی مسرّت عطا کردے جو شہروں اور اُن کے شوروغل سے کوسوں دُور، دوشیزہ

قدرت کے تکونی لبوں پر ہمیشہ رقصاں رہتی ہے۔

چلتے چلتے وہ ایک چھوٹی سی بادبانی کشتی میں روانہ ہوا۔ اس کشتی میں وہ پہلے بھی کسی جزیرے کی سیر کر چکا تھا اور اس کے باتونی ملاح سے اُس کی خاصی جان پہچان ہو گئی تھی۔ اس حریص ملاح نے اپنی جانب میں اُس سے ایک بہت بڑی رقم طلب کی تھی جس کے عوض اُس نے وعدہ کیا تھا کہ ایک ماہ تک، جہاں آپ کہیں گے، لے جاؤں گا۔ نیز آپ کے ملازم کا کام بھی کروں گا۔ پرویز نے یہ رقم بخوشی منظور کر لی اور ایک سفری خیمہ، وائلن، بستر اور کچھ مزید سامان ساتھ لیکر اُس نے اپنا بحری سفر شروع کر دیا، جیسے خانہ بدوش منزل بہ منزل اپنی مسافت طے کیا کرتے ہیں۔

ملاح گاہے پتوار چلاتا، گاہے گھٹنوں پر دونوں ہاتھ رکھ کر بیٹھ جاتا تھا۔ اور جب اُن کی کشتی ہوا کی سمت میں سبک رفتاری سے چلنے لگی تو اس ناؤ کے کھیون ہار نے پرویز سے باتیں کرنی شروع کر دیں۔ اُسے یہ بڑا عجیب سا معلوم ہوا کہ یہ شخص بغیر کسی مقصد کے، محض سیاحت کے لئے گھر سے نکلا ہے۔ وہ ابتک یہی سمجھتا تھا کہ شہریوں کے جی بہلانے اور اُن کی دلچسپیوں کے واسطے بمبئی سب سے بڑی جگہ ہے اور اُسے چھوڑ کر کوئی سیٹھ ان غیر معروف اور دیہاتوں جیسی بستی میں نہیں آسکتا۔ اسی لئے اُسے پرویز کی باتیں سُن کر اچنبھا ہوا مگر اُس نے سوچا، مجھے اس سے کیا؟ ایک مہینے بعد مجھے باقی کے تیس روپے اور مل جائیں گے۔ کاش ایسے لوگ یہاں روز آتے رہیں ..... پرویز کے سوالوں کے جواب میں ملاح نے اُسے بہت سے جزیروں اور ساحلی علاقوں کے حالات سُنائے اور وہ انہیں نہایت شوق اور دلچسپی سے سنتا رہا۔

سورج اب اپنے عروج پر پہونچ گیا تھا اور اس کی زرفشاں کرنیں سمندر کے بے چین سینے پر اس طرح ناچ رہی تھیں جیسے اتھاہ گہرائیوں میں رہنے والی ننھی ننھی جل پریاں سیم و زر کا کوئی البیلا کھیل دیکھنے اپنے عقیق و زبرجد کے محلوں سے

نکل آتی ہوں۔ دُور دُور سے بڑی بڑی موجیں آہستہ خرامی سے آ کر کشتی سے ٹکراتی تھیں، اور باتونی ملّاح ازراہِ تفنّن اُن کو اپنے چپوؤں سے ہوا میں اُچھال دیتا تھا۔

پرویز نے اسکی باتوں سے معلوم کر لیا کہ جنجر سے کے شمال مغرب اور جزیرۂ شبنم کے مشرق میں ایک وادی ہے۔ خوبصورت اور سازِ فطرت سے ہم آہنگ! وہاں طلوع وغروب کی سُنہری و روپہلی جھلکیاں دیدۂ حیراں کو اپنا انوپ روپ دکھاتی ہیں، اور وہاں پھولوں اور پھلوں کی اس قدر کثرت ہو کہ ہوائیں ہزارہا قسم کی خوشبوؤں میں بسی ہوئی چلتی ہیں۔ اس کی زمین نرم و نازک اور زرخیز ہے جس پر سبزۂ و گل کا ایسا دبیز اور دلکش فرش بچھا ہوا ہے کہ راہ گیر کو یہ احساس نہیں رہتا کہ وہ پیدل چل رہا ہے یا کسی نامعلوم فرشتے نے اسکے بازوؤں کو قوتِ پرواز عطا کر دی ہے..... اور اس سرزمینِ جمال، اس کرۂ خواب، اس محرابِ طلسم کا نام وادیٔ نشیمن ہے!

پرویز نے پُراشتیاق لہجے میں کہا: "بس تو ملّاح! ناؤ کا رُخ اُدھر ہی پھیر دو۔ میں وادیٔ نشیمن جاؤں گا"۔

بادبان ذرا ترچھے کر دیئے گئے اور کشتی منزلِ مقصود کی جانب تیزی سے چلنے لگی۔ دن ڈھلتے وہ ایک تنگنائے میں سے گذرے جس کے تھوڑے فاصلے پر کائی سے ڈھکی چٹانوں اور بادامی پہاڑیوں کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا اور دُور سے وہ ایسی معلوم ہوتی تھیں جیسے یہ ساحل کی حفاظت کرنے والی رفیع و مستحکم دیواریں ہیں جو مونگے اور مرجان کی بنی ہوئی ہیں۔ ایک جگہ پہنچ کر ملّاح کھڑا ہو گیا اور اُس نے لالہ فام ڈھلانوں کی طرف مُنہ کر کے، ہوا میں اُس نے ہاتھ پھیلاتے ہوئے کہا: "یہی وہ وادی ہے سیٹھ ــــ جہاں کہیئے کشتی ٹھہرا دوں"۔

پرویز نے تاحدِ نظر پھیلے ہوئے علاقے پر ایک نگاہِ رندانہ ڈالی اور یہاں کی محیرکن اور نشہ آور شادابیوں سے متاثر ہوتے ہوئے بولا: "بس یہیں ملّاح، یہیں!"

کشتی کو رسیوں سے باندھنے کے بعد ملّاح اور پرویز نے مل کر خیمے کو صنوبر کے سدا بہار درختوں کے سائے میں نصب کر دیا، اور پھر اندر سب ٹھیک ٹھاک کر کے پرویز باہر آ گیا۔ دور و نزدیک طلسم کی سی کیفیت طاری تھی اور سمندر کا وہ ٹکڑا جو تنگنائے میں سے ہوتا ہوا اس وادی کے پہلو میں آ نکلا تھا اپنی موجوں کے ترنّم سے اس کیف سرمدی میں اضافہ کر رہا تھا۔ خیمے سے کافی فاصلے پر، وادی کے نشیب میں آبادی کے آثار ہویدا تھے اور پہاڑیوں کی چوٹی کی طرف وہ خاموشی مسلّط تھی جس میں انسان کے لطیف احساسات اُجاگر ہوتے ہیں۔ قریبی ڈھلانوں پر سبز رنگ کے پس منظر میں سُرخی سی پھیلی ہوئی تھی جیسے کسی سیمتن نے اپنے کافوری رخساروں پر گلگونہ مل لیا ہو، اور رنگوں کا یہ دلکش امتزاج تر و تازہ درختوں اور بیلوں سے مل کر پیدا ہوا تھا جن کے پتّے سبز یا دھانی اور پھول ملاگیری یا شنگرفی تھے۔ اُسے ایسا محسوس ہونے لگا جیسے اس ساعت، کل کائنات اس وادی میں، بلکہ وادی کے اس ننھّے سے قطعے میں سمٹ آئی ہو اور وہ کسی خواب کے سفینے میں سوار، یہاں سے گذر رہا ہے۔

تھوڑی دیر میں ملّاح بستی سے کھانے پینے کی چیزیں لے آیا اور پرویز اُسے وہاں بٹھا کر چہل قدمی کے لئے پہاڑیوں کی بلندی کی طرف نکل کھڑا ہوا۔ چلتے چلتے اس کا راستہ مختلف شکلیں اختیار کرتا جاتا تھا۔ کبھی تنگ، اور بھی تنگ، جیسے کسی درے میں سے گذر رہا ہو۔ کبھی چوڑا کہ دو آدمی ساتھ ساتھ نکل سکیں اور کبھی کافی کشادہ۔ کوئی نصف فرسنگ چلنے کے بعد وہ ایسی جگہ آیا جہاں کھُلا ہوا میدان تھا اور رہگذار کے دونوں جانب چھوٹے چھوٹے کھیت لہلہا رہے تھے۔ بعض کھیتوں میں ساگ، ٹماٹر، سلاد، مٹر، چقندر اور دوسری ترکاریاں اُگی ہوئی تھیں، جو بمبئی میں ہمیشہ مرجھائی ہوئی اور باسی ہو کر بکنے آتی ہیں۔ چند قطعات صرف چیکو کے لئے مخصوص تھے جو آلو کے مماثل اور اپنی بدصورتی کے باوجود حلاوت اور لذت کی وجہ سے بمبئی کا مشہور پھل ہے۔ کہیں کہیں

کسان اپنے کاموں میں مگن نظر آتے تھے۔ ان کے ساتھ ان کی عورتیں اور بچے بھی شامل تھے اور وہ سب مل کر زمین کے خزینے سے اپنا اپنا حصہ سمیٹنے میں مصروف تھے۔ ان سے آگے پھر چڑھائی شروع ہو گئی تھی۔ بائیں جانب تھوڑے فاصلے پر، نیلی نیلی پہاڑیوں کی بلند چوٹیاں فردوسی محلوں کے حسین میناروں کی طرح مالکِ ارض و سما کی طرف منہ اُٹھائے کھڑی تھیں۔ اُن کی ڈھلانوں میں لمبی لمبی پہاڑی گھاس اور خودرو، کاسنی، اودے، سنہری اور سفید پھول بادِ جنوب کے جھونکوں سے لہرا رہے تھے اور وادی کی نازک اندام دوشیزائیں انہیں درانتیوں اور قینچیوں سے اپنی بھیڑ بکریوں کیلئے کاٹنے میں محو تھیں۔ پرویزان اوزاروں سے پیدا شدہ سرسر کی موسیقانہ آواز کو سنتا ہوا آگے بڑھ گیا اور سوچنے لگا، اس جلوہ زارِ جنت کو دیکھنے کی کس کو تمنا نہ ہوتی ہوگی؟ کم از کم زندگی میں ایک بار، ہر کہ و مہ، ہر مرد و عورت، ہر امیر و غریب ضرور یہ چاہتا ہوگا کہ وہ بھی ایک دفعہ کسی پھولوں کی وادی میں، سرسبز میدانوں میں، ساحلی علاقوں میں ہو آئے۔ یہاں آکر واقعی انسان کی تمام کثافتیں دُور ہو جاتی ہیں۔ غم کا بار ہلکا ہو جاتا ہے۔ دل کا بوجھ اُتر جاتا ہے۔

—— اور دفعتاً اُسے یوں محسوس ہوا کہ کوئی اُس کے پاس سے تیر کی طرح نکل کر برابر کے گھنے درخت کے پیچھے غائب ہو گیا ہے۔ یہ درخت اس قدر کہن سال تھا کہ اس کے بڑے بڑے تنوں سے موٹی موٹی لٹیں نکل کر زمین سے اس طرح آ ملی تھیں جیسے وہ ایک درخت کی موٹی لٹیں نہیں بلکہ وہ درخت، کئی درختوں کا مجموعہ ہے۔ اس کے نوکیلے پتے بنگلہ پانوں کی مانند چوڑے چوڑے تھے اور ارد گرد سے چڑھنے اور پھیلنے والی بیلیں کثرت سے اس کی جڑ پر رینگتی ہوئی اُس کی ڈالوں تک چھا گئی تھیں۔ اس درخت کے پاس راستہ نہایت دشوار گذار تھا اور پرویز کو یقین ہو گیا کہ جو شخص اس کے قریب سے بچ کر اس درخت کے پیچھے غائب ہو گیا ہے وہ کہیں اور

نہیں جا سکتا۔ ضرور وہیں چھپا ہوا ہے، اور اس کے دل میں تجسّس پیدا ہو گیا۔ ایسا کیوں؟ آخر کیوں یہ مجھ سے بچکر اسکے پیچھے چھپا ہے۔ اور جب وہ اسی سمت سے درخت کے جھنڈ میں گھس گیا جہاں سے وہ نادیدہ ہستی غائب ہوئی تھی تو اُس نے دیکھا کہ وہ ـــ عورت ـــ آزاد ہرنی کی طرح، جس کا کوئی شکاری تعاقب کر رہا ہو، ایک سالوں پرانی شاخ کے سہارے، غوطہ دے کر درخت کی دوسری طرف سے نکل بھاگی ہے ـــ اور پرویز ششدر و حیراں، وہیں کے وہیں کھڑا رہ گیا۔ کیا یہ واہمہ ہے؟ کیا میں چلتے چلتے خواب دیکھنے لگا ہوں؟ اور اُس نے درخت کو چھو کر دیکھا۔ اپنے آپ پر غائر نظر ڈالی۔ یہ سب حقیقت ہے اور وہ جاگ رہا ہے! پھر وہ ـــ عورت بھی حقیقت ہوگی۔ لیکن یہ کیا؟ یہ کیا؟ وہ رعنا نہیں ہو سکتی۔ مگر اس کی شکل و شباہت رعنا جیسی ہے۔ ہو بہو وہی! اور معاً وہ اس کی جستجو میں اُسی رہگذار پر آگیا جو کھیت میں بل کھاتی ہوئی پگڈنڈی کی طرح پہاڑیوں کی آغوش میں گم ہو جاتی تھی۔ وہ تیزی سے چلا جا رہا تھا کہ دفعتاً اُسے کسی نے آواز دی۔ پرویز نے مُڑ کر دیکھا کہ ایک گڈریا اپنی بھیڑوں میں گھرا ہوا اُسے حیرت سے تک رہا ہے۔ اور جب پرویز متوجہ ہوا تو اُسنے کہا "آپ کو کہاں جانا ہے؟ اُس طرف مت جائیے۔ بستی کی راہ تو پیچھے رہ گئی؟"

پرویز اپنا اشتیاق چھپاتے ہوئے بولا "نہیں میں اِدھر ہی جاؤں گا۔ اِسی راستے پر۔"

گڈریا کھڑا ہو گیا اور اُس کے نزدیک آکر کہنے لگا "نہیں سیٹھ۔ اس دوراہے کے آگے کوئی نہیں جاتا۔ وہ راستہ بڑا خطرناک ہے اور وہاں آدمی اُسی وقت جاتا ہے جب اُسے خودکشی کرنی ہو۔"

یہ سُنکر وہ اور بھی مضطرب ہو گیا اور گڈریئے سے مزید کچھ کہے سُنے بغیر اپنی پوری طاقت سے پھر اُسی راہِ ممنوعہ پر گامزن ہو گیا۔ وہ چاہتا تھا کہ اس مفرور راہی کو

پھر اپنی آنکھوں سے دیکھ لے۔ اسکے روپ میں رعنا کا درشن کرلے اور جان لے کہ وہ کیوں اپنے آپ کو ہلاک کرنا چاہتی ہو؟

یکایک وہ راستہ اُسے ایک کشادہ اور مربع نما میدان میں لے آیا جسے دیکھکر گمان ہوتا تھا کہ زلزلے کے جھٹکوں نے اُسے ٹیڑھا کر دیا ہے۔ اس کے ایک طرف چپٹی اور دیو آسا چٹانیں تھیں جن کے دامن میں مُہیب غار تھے اور دوسری طرف ایسی پُر خطر ڈھلان کہ دیکھے سے خوف آئے۔ اُس نے چاروں طرف بیتابانہ نظریں دوڑائیں اور یکلخت دیکھا کہ وہی عورت ڈھلان تک پہونچ گئی ہے اور کوئی دم میں شاید اُس اتھاہ گہرائی میں جا گرے گی جہاں گم ہو کر کوئی نہیں اُبھر سکتا۔ اور جیسے بجلی سی چمک جائے، وہ انتہائی پھرتی اور سرعت کے ساتھ اس طرف لپکا۔ اور عین اُس لمحے جب وہ بلبلِ ناشاد کی مانند شاخ حیات سے پرواز کرنیوالی تھی، پرویز نے اس کا ہاتھ پکڑ کر پیچھے کھینچ لیا: "ٹھیرئیے!"

دُخترِ کوہسار نے اُسے مڑ کر دیکھا اور کچھ نہیں بولی۔ وہ خود ہی وہاں سے ہٹ گئی اور ایک خاموش راہب کی طرح سنگ خارا کے اس چبوترے پر آ کر بیٹھ گئی جو وسطی غار کے دہانے پر بنا ہوا تھا۔ پرویز بھی اُس کے پاس آ گیا اور غور سے اُسے دیکھنے لگا۔

وہ سوچ رہا تھا کہ اگر میرے عقیدے کے مطابق تدفین کے بعد حیات و حرکات ناممکن نہ ہو جاتیں تو مجھے یقین آجاتا کہ تھوڑے سے فرق کے ساتھ رعنا یہاں دوبارہ نمودار ہوئی ہے۔ اُس روز خواب میں جو اُس نے مجھے سیر و سیاحت کی ترغیب دلائی، اس کا مطلب یہی ہوگا کہ میں اُس کو تلاش کروں۔ شاید وُہ یہ کہنا چاہتی تھی کہ میں موت کے جزیرے سے واپس آجاؤں گی مگر میری واپسی ایکے اس وادی میں ہوئی اور تم اُس سرِ خاب کی مانند جو اپنی منزل اور راہ سے

بھٹک کر ہراساں و افسردہ ہو جاتا ہے مگر ہمت نہیں ہارتا، مجھے وادیٔ نشیمن میں ڈھونڈ نکالنا؛ اور پھر، یکایک وہ اپنے خیالات سے چونکا اور اُس نے دیکھا کہ وہ سیاہ پوش عورت سسکیاں لے رہی ہے۔

پرویز نے پوچھا: "کیا آپ خودکشی کر رہی تھیں؟"

اُس نے اپنی آنکھیں پونچھیں، اور قدرے توقف کے بعد گردن اُٹھا کر پرویز کو دیکھتے ہوئے بولی:— "ہاں، آپ نے مجھے روک لیا!"

پرویز کو اب معلوم ہوا کہ اس کا اندازہ غلط تھا۔ وہ پوری عورت نہیں تھی۔ اُس کے مکھڑے کے بھولپن اور کمسنی سے صاف ظاہر ہوتا تھا کہ یہ ابھی غنچۂ نورس ہے، دُرِ ناسفتہ ہے۔ اُٹھان اور صحت کی وجہ سے وہ ذرا زیادہ عمر کی ضرور معلوم ہوتی ہے لیکن درحقیقت وہ ایسا پھول ہے جو ابھی پوری طرح نہیں کھلا۔ اس کا شباب دوشیزگی کا امین اور اس کا حسن معصومیت کا نقیب ہے۔

پرویز نے سوال کیا: "آپ خودکشی کیوں کرنا چاہتی تھیں؟"

دخترِ کوہسار نے اُسے نظر بھر کر دیکھا اور رازدارانہ انداز میں بولی: "پہلے یہ بتا دیجئے کہ آپ کون ہیں؟ کیا آپ یہاں نووارد ہیں؟"

پرویز نے پہلی بار اس کی شفاف اور نرگسی آنکھیں دیکھیں اور وہ اُن سے بڑا متاثر ہوا خصوصاً اُن کی سبز پتلیاں اُسے بڑی پُرکشش معلوم ہوئیں۔ اُس نے جواب دیا: "میں سیاح ہوں اور میرا نام پرویز ہے۔ اس پہاڑ کے جنوب میں، آبادی کی مخالف سمت جو راستہ چٹانوں کی طرف جاتا ہے، وہیں ساحل کے قریب میرا خیمہ ہے اور میں آج ہی یہاں آیا ہوں۔"

سبز چشم سحر دقد کھڑی ہو گئی اور ڈھلان کی طرف اشارہ کر کے کہنے لگی: "وہاں نیچے سمندر رہتا ہے اور اس کا ہاؤ آبادی کی جانب ہے۔ ابھی چند دن ہوئے ایک

چرواہے نے یہاں آکر خودکشی کی تھی۔ اس کی لاش بہتی ہوئی آبادی میں پہونچ گئی۔ اور لوگ سمجھ گئے کہ یہ کیسے ہلاک ہوا۔ اس وادی میں یہ ریت چلی آتی ہے کہ جسے خود دُنیا سے جانا ہو، وہ یہاں آکر جان دیتا ہے...... کبھی کبھی یہ بھی ہوا ہے کہ کوئی نوجوان یا دوشیزہ اپنی جان دینے یہاں آئی مگر کسی غیبی اشارے نے اُسے روک دیا اور وہ آبادی میں واپس آگئی ــــ آپ نہ آتے تو ابتک میری لاش سمندر میں تیرتی ہوتی۔"

پرویز نے اُسے خوابناک آنکھوں سے دیکھا اور یہ خیال کیا کہ شاید یہ مایوسِ محبت ہے۔ لیکن اسکے کچھ مزید پوچھنے سے پہلے وہ بولی "آپنے میرا پیچھا کیوں کیا تھا؟ میں نے تو کوشش کی تھی کہ آپ سے بچکر نکل جاؤں!"

پرویز نے جواب دیا "اس کی ایک وجہ ہے ــــ لیکن آپ ہی سمجھ لیجئے کہ آپ کے چھپنے سے میرا تجسّس بڑھ گیا۔ اور پھر اُس دوراہے پر مجھے ایک گڈریئے نے ادھر آنے سے منع کیا تو میں نے مصمم ارادہ کر لیا کہ میں آپ کو ضرور اس اقدام سے روکوں گا۔"

سبز آنکھوں والی بے بسی کے لہجے میں بولی "آپ کی آمد میرے لئے غیبی اشارہ ہے۔ میں نے چاہا تھا کہ اس زندگی سے چھٹکارا مل جائے مگر شاید یہ خدا کو منظور نہیں۔ میں اب واپس چلی جاؤنگی۔ اُسی ظالم کے پاس چلی جاؤنگی۔"

وہ آہستہ آہستہ چلنے لگی۔ رہ رہ کر اُس کے دل میں یہ خیال پیدا ہو رہا تھا کہ یہ شخص غم نصیب معلوم ہوتا ہے کیونکہ اس قدر خوبصورت ہونے کے باوجود اُسکی آنکھوں میں چمک اور تازگی نہیں ہے۔ اُسے بھی کوئی دُکھ پہونچا ہوگا، اُس نے بھی کوئی صدمہ اُٹھایا ہوگا۔

پرویز نے اس کا راستہ روک لیا اور عاجزی سے کہنے لگا "ذرا ٹھہر جائیے۔"

وہ رُک گئی۔ اُس نے اس کی طرف اشتیاق اور حیرت سے ملی جلی نگاہوں سے دیکھا اور بھولپن سے بولی۔" آپ مجھے یوں کیوں دیکھ رہے ہیں؟ آپ۔ نے مجھے کیوں ٹھہرایا ہے؟"

پرویز سے ضبط نہ ہوسکا۔ اُس کی اُداس آنکھیں پُرنم ہوگئیں اور اُس کے مُنہ سے بے اختیار نکل گیا۔" آپ کو دیکھکر مجھے کوئی یاد آرہا ہے ــــ خیر، آپ مجھے اپنا نام بتائیں گی؟"

سبز چشم نے اُسے ایسی نظر سے دیکھا جس میں تسلّی اور دلاسہ تھا۔ اور ہمدردانہ لہجے میں کہنے لگی" میرا نام نغمانہ ہے۔ کیا میں کسی کی ہم شکل ہوں؟"

پرویز اُسے ٹکٹکی باندھے دیکھے گیا، جیسے اس وقت رعنا اس کے سامنے کھڑی ہے۔

نغمانہ نے کہا" آپ نے میرے سوال کا جواب نہیں دیا؟"

وہ بولا" جی ہاں۔ مگر آپ جس کی ہم شکل ہیں وہ اب اس دُنیا میں نہیں ہے، اور اس لئے میرا دل چاہتا ہے کہ آپ کو جی بھر کے دیکھے جاؤں۔ لیکن یہ کیسے ممکن ہے؟ آپ زیادہ دیر تو نہیں ٹھہر سکتیں! اچھا ــــ معاف کیجیے میں نے آپ کو ناحق روکا"

اور جب وہ راستے سے ہٹ گیا تو سورج تھکے ہارے جواری کی طرح، جو جیت کی اُمید پر اپنا سب کچھ لُٹا چکا ہو، چُپکے چُپکے غروب ہونے لگا اور چاروں طرف افسُردگی سی چھا گئی۔ ڈھلان کے دامن میں بہتے ہوئے سمندر کی سائیں سائیں سے دُور تک پھیلے ہوئے سکوت کا احساس دم بہ دم زیادہ ہو رہا تھا اور جگہ جگہ چھالیہ اور دارچینی کے طویل القامت درخت اپنی ہلکی ہلکی جنبشوں سے روزِ روشن کے انجام کو اور بھی حسرت فزا بنا رہے تھے۔ پرویز بولا" اب آپ جائیے۔ ایسا نہ ہو اندھیرا چھا جائے"

نغمانہ دو قدم چل کر رُک گئی اور اُس نے مڑ کر پوچھا" آپ یہاں کیا کریں گے؟

چاند نکلنے سے پہلے یہاں بڑی خوفناک تاریکی ہوگی۔ آپ نووارد ہیں، ایسا نہ ہو آپ راستہ بھول جائیں"۔ اور اُسکے چلنے کا اشارہ کرنے پر وہ اسکے ساتھ ہولیا۔

اُن دونوں کو چلتے ہوئے تھوڑی دیر ہوئی تھی کہ آفتاب نظروں سے اوجھل ہوگیا۔ اُسکے پیرہن کی سیاہی ہر چہار طرف پھیل گئی اور ستارۂ شام کے نمودار ہوتے ہی چمگاڈریں وحشت زدہ درختوں سے اُڑ اُڑ کر فضا میں منڈلانے لگیں۔ اب وہ دشوار گذار راستے پر چل رہے تھے۔ کہیں کہیں گھاٹیاں اور ڈھلانیں بھی آجاتی تھیں، جن کی وجہ سے اندیشہ تھا کہ کہیں پاؤں نہ پھسل جائے۔ دفعتاً نغمانہ نے اپنا ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا" یہ بڑا خطرناک راستہ ہے۔ آپ میرا ہاتھ پکڑ لیجئے۔ یہ زمین میرے پاؤں کو لگی ہوئی ہے"۔ پرویز نے فوراً اس کے ہاتھ کا سہارا لے لیا اور اس اتصال کے ہو جانے سے، جیسے اُن دونوں کے جسم ایک دوسرے کے ہمراز بن گئے۔ اُن کی زبانیں خاموش تھیں مگر اُن کے دل ایک دوسرے کی دھڑکن بخوبی سُن رہے تھے۔

موڑ پر پرویز کو ٹھوکر لگی مگر نغمانہ نے اپنے قوی ہاتھ سے اُسے سنبھال لیا اور وہ ذرا شگفتہ آواز میں بولی" دیکھا آپ نے!"

اُس کو اس وقت احساس ہوا کہ اس کی ہمسفر طاقت ور ہے اور باوجود حزن و ملال کے اسکے لب و لہجہ میں شیرینی اور دلنوازی ہے۔ وہ جواباً بولا" آپ نے مجھے بچالیا ورنہ میں شاید کھڈ میں جا گرتا"۔

کچھ دیر دونوں خاموش چلتے رہے، اور جب پرویز سے نہ رہا گیا تو اُس نے سکوت توڑا" میں نے آپ سے ایک بات پوچھی تھی، اس کا آپ نے جواب نہیں دیا"۔

"کونسی بات؟" نغمانہ نے اندھیرے میں اسکی طرف مڑتے ہوئے پوچھا۔

"آپ وہاں قلۂ کوہ پر کیوں گئی تھیں؟ آپ کو ایسا کونسا صدمہ پہونچا ہے؟"

اُس نے آہِ سرد بھر کر جواب دیا: "اس پر آپ اصرار نہ کیجیے تو بہتر ہے ـــــ"

وہ دونوں پھر خاموش ہو گئے اور چپ چاپ اپنا راستہ طے کرتے رہے۔ یہاں تک کہ ملکۂ شب کا نور فگن آویزۂ گوش، آسمان کے آنچل پر پوری تابانی سے جگمگانے لگا اور ظلمات کی بلائیں غولِ بیابانی کی طرح وادیٔ نشیمن سے روپوش ہو گئیں۔

آخر وہ پہاڑی کے جنوب میں، اُس مقام پر آ کر رک گئے جہاں سے ایک راستہ آبادی کو جاتا ہے اور دوسرا اس کی مخالف سمت میں، اُن چٹانوں کی طرف، جہاں پرویز کا خیمہ نصب تھا۔

پرویز نے ساحل کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا: "وہ دیکھیے ـــــ وہاں، سفید سفید! وہی میرا خیمہ ہے ......"

نعمانہ نے بصد شوق اُدھر دیکھا۔ چاندنی رات میں خیمے کی سفیدی الگ نظر آ رہی تھی۔ پھر اُس نے اپنی صراحی دار گردن کو نزاکت سے جنبش دی، جیسے وہ رخصت ہونا چاہتی ہے، اور پرویز اس کا عندیہ پا کر بولا: "میں کل صبح آبادی میں آؤں گا۔ آپ کہاں رہتی ہیں؟ کیا آپ سے ملنا ہو سکے گا؟"

جیسے وہ اب تک کچھ بھولی ہوئی تھی، یہ سن کر اُسے سب کچھ یاد آ گیا اور ایسا معلوم ہونے لگا کہ کسی خیال نے اُسے ڈرا دیا ہے۔ پریشان کر دیا ہے۔ چنانچہ وہ جلدی جلدی یہ کہتی ہوئی: "میں ـــ میں باغ والے سُرخ مکان میں رہتی ہوں" نشیب کی طرف روانہ ہو گئی۔ پرویز اُسے جاتا ہوا دیکھتے رہا، اور جب وہ نظروں سے اوجھل ہو گئی تو وہ اُس کے خیالات میں کھویا ہوا، آہستہ آہستہ قدم اُٹھاتا، اپنے خیمے میں داخل ہوا۔

ملّاح نے خیمے کے اندر قندیل روشن کر دی تھی اور اُسکے زعفرانی پرتو میں وہ

کھانا دکھائی دے رہا تھا جس کا انتظام اُس نے اپنے آقا کے لئے کیا تھا۔ پرویز کو تکان بری طرح محسوس ہو رہی تھی۔ تاہم تھوڑا بہت کھانا کھا کر وہ اپنے اسٹریچر پر دراز ہو گیا۔ ملاّح کو بھی نیند آنے لگی تھی اس لئے وہ سونے کے لئے اپنی کشتی میں چلا گیا اور پرویز تنِ تنہا قندیل کو غور سے دیکھنے لگا جس کی باریک کرنیں تارِ نظر کی مانند اُس سے قریب، بلکہ قریب تر ہوتی جا رہی تھیں۔ اس کی نگہ چند لمحات یونہی ٹھہری رہی کہ آپ ہی آپ اُس کے نفسِ شعور کا دائرہ، اُسے محسوس ہوئے بغیر، تبدیل ہو گیا۔ اور اس نئے دائرے کا مرکز، قندیل کی زر دتنویر کے بجائے نغمانہ کا سیاہ پوش پیکر تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ یہ سمن اندام آخر ایسے کس رنج میں مبتلا ہے جس نے اسکے عارضِ گل رنگ پر غروبِ آفتاب کی سی افسردگی طاری کر دی ہے؟ وہ کیا دُکھ ہو جس نے اس زہرہ جبیں کو ہراساں و سراسیمہ کر رکھا ہے؟ اور وہ کون ظالم ہے جسکے خیال نے اسکی صندلی پیشانی اور سبز آنکھوں میں خوف بسا دیا ہے۔

ساحلی گلستانوں میں طائرانِ خوش گلو کے شیریں نغمات نے حسینۂ سحر کا خیر مقدم کیا اور پرویز نے کروٹ لیکر آنکھیں کھولدیں۔ کہیں دُور، کسی مؤذّن کی پُر تاثیر دعوتِ نماز وادی کی پہاڑیوں سے ٹکرا ٹکرا کر فضائے بسیط میں ایک عالمِ سرمدی پیدا کر رہی تھی اور " الصّلوٰۃ خیرٌ مّنَ النّوم "، کا نعرۂ مقدّس صدائے بازگشت بن کر قلب کی پہنائیوں میں جذب ہو رہا تھا۔ پرویز کو ایسا معلوم ہونے لگا جیسے اس کا دل، عرصہ دراز بعد خدائے عزّوجل کے آگے سر بسجود ہونے کی طرف مائل ہے۔ اُس کا باطن، اس گوشۂ تنہائی میں، مالکِ دو جہاں سے لو لگانے کے لئے بے قرار ہے۔ اس کی روح، منبع انوار کے حضور، سرِ عبودیت خم کرنے کے لئے بیتاب ہے۔ چنانچہ جب وہ قادرِ حیات و ممات کے دربار میں

اُس خلوصِ قلب سے حاضری دے چکا، جو اپنے معبود کی بارگاہ میں، عابدِ نیک نفس کے لیئے ضروری ہے، تو اُسے ایسا محسوس ہوا کہ وہ فرحت و اطمینان کی دولت سمیٹ لایا ہے۔ اس کا بارِ غم ہلکا ہو گیا ہے اور اس کی طبیعت میں بشاشت آ گئی ہے۔

خیمے کے باہر بیکراں لاجوردی آسمان پر نورِ سحر نمودار ہو رہا تھا۔ سمندر کی موجیں پتھریلے راستوں سے ٹکراتی ہوئی اپنا دائمی گیت گا رہی تھیں۔ جگہ جگہ نیم چنبیلی اور دیودار کے ٹھنڈے اور نشہ آور درخت ابھی نیند کے پالنے میں جھول رہے تھے۔ تر و تازہ پتّوں پر شبنم رقص کر رہی تھی۔ شاخوں پر قمبر اور سمندری طوطے چہک رہے تھے اور دن کے بڑھتے ہوئے اجالے میں سبزہ و گل ہر سو نمایاں اور واضح تر ہوئے جا رہے تھے، غرض، صبح طلوع ہو رہی تھی! صبح، یعنی رمزِ حیات کا اولین سبق۔ رازِ کائنات کی ابتدائی منزل۔ صحیفۂ قدرت کا پہلا ورق!

چائے سے فارغ ہو کر وہ آبادی کی طرف چلنے لگا کہ اچانک ایک اودبلاؤ اسکے پاس سے سر سے نکلا اور غڑپ سے سمندر میں کود گیا۔ اُس کی چال اُسے بے حد دلچسپ معلوم ہوئی جو خرگوش کے پھدکنے اور کنگرو کے پھلانگنے سے ملتی جلتی تھی اور وہ تفریحِ طبع کے لیئے اُس کے پیچھے پیچھے ساحل تک چلا گیا۔ وہاں پہونچکر اُس نے دیکھا کہ ہرے بھرے درختوں کی ٹھنڈی چھاؤں اور چٹانوں کی اوٹ میں بیشمار بطیں، مرغابیاں، قاز اور دیگر آبی پرندے برات کی طرح قطار اندر قطار بیٹھے ہوتے ہیں۔ اس کا جی بے اختیار چاہا کہ کاش میرے پاس اس وقت بندوق ہوتی تو میں نہایت شوق سے ان کا شکار کرتا۔ لیکن فوراً ہی اس کے اشتیاق پر غبار سا چھا گیا۔ شکار کوئی ایسی مردانگی تو نہیں جس سے خوشی حاصل کی جائے۔ بےزبان جانوروں پر بندوق چلانا اور اُن کے گلے پر چھری پھیرنا ایسے بہادری کے کارنامے تو نہیں جن پر جی جائز طور پر خوش ہو! اور چھری کے تصوّر نے اسکے نیم شعوری ذہن

میں بے چینی سی پیدا کر دی۔ ایک نیند کا ماتا خیال، انگڑائی لیکر جاگ اُٹھا اور جیسے کوئی سفاک اپنا دھار دار خنجر کسی شیر خوار بچّے کے پیٹ میں بھونک کر جیتے جیتے لہو کا دریا بہا دے، اس کی نظروں کے سامنے خون کی سُرخی اپنی پوری ہولناکیوں کے ساتھ پھیل گئی۔ خون! خون!! بے شک خون بہانا حد درجے خوفناک اور ظالمانہ فعل ہے، پھر بھی اس حیوانیت سوز حرکت کو پسند کیا جاتا ہے۔ دوسرے کو قتل کر دینے سے دل کو خوشی ہوتی ہے اور جی چاہتا ہے کہ پھر ایک دفعہ اپنے ہاتھ کسی کے لہو سے رنگے جائیں۔ کسی کے خون سے ہولی کھیلی جائے۔ اور ہاں، اس شوقِ خونریزی پر موپساں نے بھی تو ایک جگہ تنقید کی ہے۔ مگر کہاں کی ہے؟ کیا کی ہے؟ اور اُسے یاد آیا کہ اپنے افسانے "جنونی" میں جو انسانیت اور تہذیب پر نہایت لطیف طنز ہے، وہ کہتا ہے کہ نہ صرف جانور دوسروں کو پھاڑ کھاتے ہیں بلکہ انسان بھی دوسرے کو بے رحمی سے قتل کر دینے کا دلدادہ ہے۔ اس میں یہ عادت ابتدا ہی سے پڑی ہوئی ہے۔ البتہ تہذیب اور سماجی پابندیوں کی وجہ سے اس ازلی عادت میں تھوڑی سی تبدیلی پیدا ہو گئی ہے۔ اب ایک انسان دوسرے انسان کو قانون کے ڈر سے جان سے نہیں مارتا مگر دیویوں اور دیوتاؤں کے نام پر بھینٹ تو چڑھا دیتا ہے۔ اوہام یا عقائد کے مطابق انسانی قربانی تو دیدیتا ہے! اور جہاں اس سے زیادہ روشن خیالی ہے، وہاں قوم کی قوم، ملک کا ملک اپنے ہمسائے پر چڑھائی کر دیتا ہے۔ جنگ کے نام سے قتل و غارتگری کی جاتی ہے، دشمن کے ملک میں نہایت بیدردی سے اپنے ہمجنسوں کا خون بہایا جاتا ہے، تیر اور کمان، نیزے اور بھالے، تلوار اور بندوق تو پرانے کھلونے ہوئے اب بم اور دیگر ہیبت ناک ہتھیار ایجاد ہو چکے ہیں جن کا مقصود زیادہ سفاکی اور زیادہ سنگدلی کرنا ہے۔ چنانچہ اسی جذبۂ قتل اور دوسرے کا لہو بہانے کا شوق پورا

کرنے کے لئے اپنے بے شمار پڑوسیوں کی جانیں ضائع کی جاتی ہیں۔ ہزار ہا آدمی رشتۂ حیات سے محروم کر دئے جاتے ہیں۔ خون کی ان گنت ندیاں بہا دی جاتی ہیں اور جو لوگ ایسا کرتے ہیں انہیں فاتح کا خطاب دیکر اُن کی عزت کی جاتی ہے۔ انہیں انعام واکرام عطا کئے جاتے ہیں۔ اُن کا گھر گھر چرچا کیا جاتا ہے۔ اور جو بیچارے خود میدانِ جنگ میں شرکت نہیں کر سکتے، یعنی خود خون کی مہندی سے اپنے ہاتھ نہیں رچا سکتے، وہ کم از کم اپنے عزیزوں اور رشتے داروں کی بہادری کے کارنامے سنکر کہ انہوں نے سینکڑوں بندگانِ خدا کے سر تن سے جدا کر دئے، جی ہی جی میں خوش ہو لیتے ہیں اور یہ سب کچھ کیوں نہ ہو؟ اس جذبے میں تاثیر جو اتنی ہے متمدن لوگوں کیلئے اس میں نشہ جو اس قدر ہے!! لیکن جنگ ہمیشہ نہیں ہوتی اس لئے یہ جذبہ ایک اور صورت اختیار کرتا ہے اور وہ ہے شکار۔ لہذا یہ ہر وقت کیا جاتا ہے۔ اس پر کوئی پابندی نہیں۔ جانوروں کی زندگی کی کسی کو پروا نہیں۔ اُن کے خون کی کوئی قیمت نہیں۔ گویا جنونِ قتل کا عظیم ترین اظہار، جنگ، اور حقیر ترین شکار ہے۔ لیکن اس کی کیا وجہ ہے؟ کیوں ہم پر یہ بربریت طاری ہو جاتی ہے؟ کیوں ہمیں صرف اپنی ہی جیت اور تسکینِ شوق کا خیال رہتا ہے؟ کیوں ہمیں یہ احساس نہیں رہتا کہ مقتول کے متعلقین کو ہمارے جنون سے دکھ پہنچا ہو گا؟ انہیں صدمہ ہوا ہو گا؟

اور صرف شکار ہی کو لیا جائے تو کیا بسا اوقات ایسا نہ ہوتا ہو گا کہ بندوق کا نشانہ آنِ واحد میں نر و مادہ میں سے ایک کو دوسرے کی رفاقت سے ہمیشہ کے لئے محروم کر دے ـــــــ اور یہ سوچتے سوچتے حرم خیال میں ایک دیئے سے دوسرا دیا روشن ہو گیا اور اُسے علامہ راشد الخیری کی نظم "سرخاب کا دمِ واپسیں" یاد آئی جس میں یہ فلسفی ادیب، ایک ایسا ہی فسانۂ الم بیان کرتا ہے۔ اُسے یاد آرہا تھا۔

کنارِ برہم پُتر پر ایک جا | نشیمن تھا چھوٹا سا سرخاب کا
گذر سے بہت دُور انسان کے | نر و مادہ دونوں وہاں رہتے تھے
خوشی اُس نشیمن پہ قربان تھی | یہ کُٹیا مسرت کی ایک کان تھی
پرستش میں تھی نر کے مادہ اگر | تو قربان سو جان سے اُس پہ نر
نشے میں محبت کے سرشار تھے | کہ مونس تھے آپس میں غمخوار تھے

...... اور اس کے آگے فسانہ و نظم کے نازک پیمانوں میں سے گذرتی ہوئی اِس معصوم جوڑے کی حسیات اور ایک صیاد کی شقاوتِ قلب کی پُر اثر داستان۔ پرویز سوچتا رہا کہ شکاری کس قدر بیدرد تھا جس نے دھان کے کھیت کا فریب دیکر سرخاب کو اپنے دام میں پھانس لیا۔ اور پھر، سرخاب کے فراق میں اُس کی مادہ کی بے چینی و اضطراب، اُس کی دل دہلا دینے والی آہ و بکا۔ اور بالآخر اپنے نر کو ذبح ہوتے ہوئے دیکھکر اس کی فریاد و التجا، اس کا نالہ و شیون۔ اس کا مچلنا اور تڑپنا! لیکن اس پر بھی شکاری کو رحم نہیں آیا۔ اُس نے مطلق ترس نہیں کھایا ہنس ہنسکر اپنے شکار کو ذبح کرتا رہا۔ اپنی کامیابی پر مسرور ہوتا رہا۔ بیشک اس سے زیادہ لطف اور مزہ اُسے کہاں آتا؟ ....

ناگہاں اُس کی نظر سمندر کے اُس پار خاورِ مشرق پر پڑی جو سطحِ آب سے آہستہ آہستہ اُبھر رہا تھا۔ اس کی درخشانی اِس وقت اُس بتِ سیمیں کی نورانی پیشانی کی مانند معلوم ہوتی تھی جس کے لبوں سے مئے گلگوں سے لبریز جام لگا ہوا ہو۔ اور اسکی زرنگار کرنیں کرۂ ارض کی جانب اس طرح آمادۂ سفر تھیں جیسے کسی کے رُخِ آتشیں سے حُسن کی چمکتی ہوئی شعاعیں چھوٹ رہی ہوں۔ پرویز کا دھیان بٹ گیا۔ قطاروں میں بیٹھے ہوئے بے ضرر اور خوبصورت پرندوں پر اُس نے ایک پُر رحم

نگاہ ڈالی، جیسے وہ اُن سے کہہ رہا ہو" مجھ سے نہ ڈرو، میں تمہیں ذبح نہیں کروں گا،
مجھے تو شکار سے نفرت ہے" اور وہ اُنہیں اپنے ہم جلیسوں میں خوش و خرم دیکھتا ہوا،
وہاں سے مُڑا اور آبادی کی جانب روانہ ہو گیا۔

نشیب میں جانے والی پگڈنڈی چراگاہوں اور مرغزاروں میں سے ہوتی ہوئی
گذرتی تھی۔ جگہ جگہ دستِ قدرت کے سجائے ہوئے کنج اور فردوسِ نظر باغیچے،
عالمِ سرشاری میں جھُوم رہے تھے۔ دُور دُور تک صدہا قسم کے حیات افروز درخت
اور وضع وضع کے رنگ برنگے پھُول اور کلیاں آرائشِ جمال میں مصروف تھیں جن
میں بارآور شگوفے بھی شامل تھے اور ایسے بھی جن کا مقصد تو محض اظہارِ حسُن اور
عطر بیزی تھا۔ برگ و گل کے اس تموج میں وہ بیلیں بھی شریک تھیں جن کی نازک
پتیوں پر حسین و جمیل تیتریاں ناچ رہی تھیں۔ جب وہ ایک گل سے دوسرے گل،
ایک کلی سے دوسری کلی اور ایک پودے سے دوسرے پودے پر جا کر بیٹھتیں تو
اُن کے پر ہوا میں اس طرح تھرتھرانے لگتے تھے جیسے وہ خود رقص کرتا ہوا پھُول
بن گئی ہیں، ایسا پھُول جس کی پنکھڑیاں بارِ شبنم سے لرز رہی ہوں۔ نسیم صبح بھی
اس وقت اس طرح نرم رفتاری سے چل رہی تھی گویا اس کی چال خمار آلودہ ہے۔
اس کے قدم لغزیدہ ہیں اور وہ ہزار ہا قسم کی خوشبوؤں میں ڈوبی ہوئی رقص
کناں ہے۔ رنگ و بو کے اس بے پناہ ہجوم میں وہ پگڈنڈی کبھی یوں بل کھا جاتی
تھی جیسے کسی کافر ادا کی کمر اندازِ محبوبانہ سے لچک جائے اور کبھی اس طرح سیدھی
دُور دُور تک نظر آنے لگتی جیسے تاروں بھرے آسمان میں کہکشاں نکل آئی ہو کہیں
کہیں شاما یا کوئی اور ننھی منی خوبصورت چڑیا اکیلی مل جاتی جو پتوں کے جھرمٹ میں
چھپی ہوئی اپنی باریک سُریلی سیٹیاں بجاتی ہوتی ورنہ بالعموم چمن زادیاں اپنی اپنی ٹولیوں
میں ایک ساتھ مل کر فضا میں شورِ موسیقی بپا کر رہی تھیں۔

پرویز جلدی راہ طے کرنی چاہتا تھا مگر اس گل وعنبر فشاں ماحول میں اس قدر کشش تھی کہ اس کے قدم سست رفتار ہو گئے تھے۔ اُس نے اپنی آنکھیں اور انکے ساتھ اپنا دیدۂ دل پوری طرح وا کر دیا۔ گویا وہ اس ساری فضا میں جذب ہو جانا چاہتا ہے یا خود اس سارے گرد و نواح کو اپنے میں سمو لینے کا متمنی ہے۔ اُسے اپنے چاروں طرف قدرت مسکراتی ہوئی معلوم ہوتی۔ جیسے زندگی اور شادابی کے یہ نادرہ کار نقوش اُس سے سرگوشی کے پُر مسرت لہجے میں کہہ رہے ہیں "خوش آمدی اے سیّاح! خوش آمدی!"

اب پگڈنڈی میدان میں اُتر آئی تھی جہاں کہیں کہیں کوئی مصفّا ندی یا نالہ لاابالی نوجوان کی طرح اٹھلاتا چلا جاتا تھا۔ تھوڑے تھوڑے فاصلوں پر کھپریلوں اور چھپروں سے ڈھکے ہوئے مکانات نظر آجاتے تھے اور پرویز کی نگاہیں اُن مکانوں کا بے چینی سے جائزہ لے رہی تھیں۔ حتیٰ کہ عام رہگذر سے ہٹ کر اُسے مغربی سمت میں ایک وسیع و عریض باغ کے بیچوں بیچ سرخ رنگ کا خوبصورت مکان دکھائی دیا اور وہ بے محابا اُس راستے پر آگیا جس کے دونوں جانب ہرے بھرے اور پھولدار درختوں کی پھنگیں آپس میں ہم آغوش ہوکر شامیانہ سا بناتی تھیں۔ صدر دروازے پر پہونچ کر وہ ذرا دیر کے لئے رُکا۔ پھاٹک سے عمارت تک ایک چھوٹا سا سرسبز قطعہ زمرد کے نگینے کی مانند آراستہ و پیراستہ تھا جس کے گرداگرد گلِ اشرفی، شاخ شبّو اور گلاب کے پھولوں کی گوٹ لگی ہوئی تھی اور اس کے سروں پر سرو و شمشاد کے گھنیرے درخت سنتریوں کی طرح سر اُٹھائے کھڑے تھے۔ اس قطعے کے دونوں جانب گھر بیو کھیت اور کیاریاں تھیں جن میں تخم ریحان کو کنارا اور کیاس کے علاوہ متفرق پھلوں کے پودے اور درخت لگے ہوئے تھے۔ ان کی آبیاری کے لئے چھوٹے چھوٹے پیمانے پر ندیاں سی بنی ہوئی تھیں جن میں قریب کے منزلِ کم چھرنے سے

پانی کو کاٹ کر لایا گیا تھا۔

ہر طرف خاموشی مسلّط تھی اور پرویز منتظر تھا کہ کہیں سے اس کے مکینوں کا نشان ملے۔ آخر تھوڑی دیر بعد بادِ مشرق کا ایک جھونکا آیا اور اس کے جلو میں وہ آواز سُنائی دی جو دودھ دوہنے اور تھنوں کی نکلی ہوئی دھاروں کے بالٹی سے ٹکرانے میں پیدا ہوتی ہے۔ وہ اندر داخل ہو گیا اور دائیں ہاتھ کی روش پر آہستہ آہستہ چلنے لگا۔ سامنے ساون بھادوں میں وہی دخترِ کوہسار، وہی دوشیزۂ بہار، وہی سبز پتلیوں والی نغمانہ ایک موٹی تازی گائے کا دودھ دُوہ رہی تھی۔ اس کے آس پاس پلی ہوئی بھیڑ بکریاں جگالی کر رہی تھیں اور وہ گاہے گاہے ان کی آوازوں کے جواب میں محبت بھرے جُملے کہہ دیتی تھی۔ جانے ایک بھیڑ کے بچّے کے جی میں کیا آیا کہ وہ پیچھے سے آکر اس کا پیٹ اپنے سر سے سہلانے لگا۔ نغمانہ اس گدگدی سے کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ اس کے اس قہقہے میں لحنِ داؤدی کی شیرینی تھی، نغمۂ بربط کی لنوازی تھی اور رقصِ ناہید کی بے ساختگی تھی۔ پرویز نے اسکے حسنِ معصوم سے یوں متاثر ہو کر اُسے ہولے سے پکارا۔ وہ ایکدم مڑ گئی اور اُسے اپنی نگاہوں کے سامنے دیکھکر چند ساعت کیلئے حیران رہ گئی۔ پھر اُس کے پتلے پتلے یاقوتی لبوں پر تبسّم آگیا اور وہ سب کچھ بھول کر کہنے لگی "آپ یہاں؟ ــــ آیئے"

اس کے اشارہ کرنے پر، پرویز وہیں گھاس کے مخملیں فرش پر بیٹھ گیا۔ نغمانہ ڈونگے میں دودھ بھر کر اس کی طرف بڑھاتے ہوئے بولی "یہ میری نرگس کا دودھ ہے۔ لیجیئے"

پرویز نے دودھ کا پیالہ اسکے ہاتھ سے لے لیا اور نغمانہ، اسکی متشکرانہ نگاہوں سے نظر بچا کر اپنی گائے کی گردن پر پیار سے ہاتھ پھیرتے ہوئے بولی "مجھے اس سے بڑی محبت ہے، اور یہ بھی مجھے بیحد چاہتی ہے۔ چکھئے نا۔ یہ دودھ بڑا لذیذ ہے۔

اس ساری وادی میں کوئی بھی گائے اسکی برابری نہیں کرسکتی"۔

پرویز نے نہایت شوق سے پیالہ منہ کو لگا لیا اور لغمانہ اُسے پُر اشتیاق نظروں سے دیکھنے لگی۔ اُسے ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ اس کا دل اس خوبصورت اجنبی کو دیکھکر خود بخود کوئی نامعلوم سی خوشی، کوئی انجان سی تسلّی اور کوئی ان دیکھی اُمید محسوس کر رہا ہے۔ لیکن وہ ابھی دودھ نہیں ختم کرنے پایا تھا کہ کسی نے پیچھے سے نہایت کرخت لہجے میں لغمانہ کو پکارا۔ وہ طائرِ نو گرفتہ کی طرح افسردہ و خائف ہو گئی اور پرویز کو یوں محسوس ہوا کہ کسی نے شیش محل پر پتھر کھینچ مارا ہے۔ اُس نے پیالہ منہ سے ہٹا کر الگ رکھدیا اور اس کریہہ آواز کو غور سے سننے لگا۔

وہ شخص تیز گامی سے قریب آگیا اور اس نے اس لہجے میں جس میں "ایک ہی راستہ"، کا دولن شیخ مختار کسی سے مخاطب ہو، درشتی سے پوچھا "کون مردود ہے یہ؟"

پرویز کو ایسا محسوس ہوا جیسے کسی نے اس کے گلے پر طمانچہ مارا ہے۔ غصّہ سے اس کا چہرہ سرخ ہو گیا اور جب تک وہ شخص اس کے سامنے آیا، وہ اُٹھکر کھڑا ہو گیا۔ دونوں نے ایک دوسرے کو بغور دیکھا۔ سر سے پاؤں تک معائنہ کیا اور اپنے اپنے پیمانے میں وہ ایک دوسرے کو تولنے لگے۔ اور اس افسانے کا مُصنّف اپنے تصوّر میں اُن کو اس طرح آمنے سامنے دیکھنے لگا جیسے وہ الگ الگ انسان نہیں بلکہ ڈاکٹر جیکل اور مسٹر ہائڈ کی طرح ایک ہی کردار کی دو شخصیتیں ہیں۔ پرویز نے ایک نظر میں اُس کے بشرے اور جسمانی حالت سے اندازہ لگا لیا کہ یہ شخص بدزبان اور کمینہ ہے۔ اسے ہر شے میں بُرائی اور ہر جذبے میں بدی نظر آتی ہے۔ وہ حُسن اور نیکی سے محروم ہے۔ اُسے نہیں معلوم کہ شائستگی اور اخلاق کسے کہتے ہیں؟ اس کی عمر تیس پینتیس کے لگ بھگ تھی مگر اُس کی

صورت سے صاف ظاہر ہوتا تھا کہ یہ اپنی صحت کھو چکا ہے۔ اس میں خون کی کمی ہے اور شاید آپ ہی آپ سلگنے کی عادت نے اس میں ضبط اور استقلال زائل کر کے اسے چڑچڑا اور بدتمیز بنا دیا ہے۔ یا پھر یہ مغرور ہے۔ سینے میں جھکاؤ اور ٹانگوں میں خم ہونے کے باوجود اسکے سر میں تکبر اور برتری کا سودا سمایا ہوا ہے۔

مسٹر ہائنڈ نے نعمانہ کی طرف مڑ کر کہا۔ "تو اس سے کیا باتیں کر رہی تھی؟۔۔۔ کون ہے یہ؟"

نعمانہ نے پرویز کو گھبرائی ہوئی نگاہوں سے دیکھا اور لڑکھڑاتی ہوئی آواز میں بولی۔ "یہ۔۔۔ یہ۔۔۔"

"یہ کیا؟۔۔۔" وہ ہنکارا۔ "یہ بولتا کیوں نہیں؟ اسے جو کچھ کام ہے مجھ سے کیوں نہیں کہتا؟"

پرویز اپنے آپ کو سنبھالے رہا اور اُس نے بمشکل نرم لہجے میں کہا۔ "آپکی گفتگو کا یہ انداز کیا ہے؟ کیا شرفا اسی طرح باتیں کرتے ہیں؟"

"تم اس بنگلے میں کس کی اجازت سے گھسے؟ تمہیں ایک غیر عورت سے دودھ لیکر پیتے ہوئے شرم نہیں آئی؟۔۔۔ اور مجھ سے پوچھتے ہو کہ گفتگو کا یہ انداز کیا ہے!"

پرویز کے جواب دینے سے پہلے وہ دو قدم پیچھے ہٹ گیا اور احساسِ برتری نے اس کی آواز میں اور بھی بلندی پیدا کر دی۔ "چلے جاؤ یہاں سے۔ میں لفنگوں سے ہمکلام نہیں ہوتا۔ تم شاید اس لئے آئے تھے کہ مجھ سے جیکو اور موسمیوں کا سودا کرو۔ جاؤ، مجھے کچھ منظور نہیں۔ میں آوارہ لوگوں سے تجارت کرنا بھی اپنی توہین سمجھتا ہوں!"

پرویز آگ بگولا ہو گیا مگر اس کا شعور اُسے بے قابو ہو جانے سے برابر روکے

رہا۔ کیونکہ ——— کیونکہ اِس سے چند ہی قدم کے فاصلے پر نغمانہ یوں کھڑی تھی جیسے وہ اُس سے شرمسار اور مسٹر ہانڈ سے خوفزدہ ہے۔ چنانچہ اس کی خاطر وہ اپنی زبان بند رکھنے پر مجبور تھا۔ آخر جاتے جاتے اُس نے اُسے رحم آلود نظروں سے دیکھا اور خاموشی سے وہ اس باغ والے سُرخ مکان کے احاطے سے باہر نکل گیا۔

اندر سے ابھی آواز آرہی تھی " یہ مجھے اس طرح گھور رہا تھا جیسے مجھے جان سے مار دیگا۔ اور تجھ پر اسکی نگاہیں اس طرح پڑ رہی تھیں گویا وہ تیرا عاشق ہے۔ ادھر آ، بتا تو نے اِسے اندر کیوں آنے دیا؟......"

پرویز اپنے خیالات میں غلطاں و پیچاں آہستہ آہستہ چڑھائی کی طرف جا رہا تھا۔ اس کے چہرے سے بشاشت اور چونچالی رخصت ہو گئی تھی اور اسکے ماتھے پر بل پڑ گئے تھے۔ نغمانہ کی معصوم مہماں نوازی اور اس کی سادگی و جمال نے اس پر بڑا اثر کیا تھا، اور اس سے زیادہ وہ اُس بدمزاج شخص نے جس کی بلاوجہ توہین نے اس کے پندار میں گویا زخم لگایا تھا۔ رہگذار پر جگہ جگہ سُرخ بجری کے علاوہ نیلے، پیلے، سبز اور بادامی سنگریزے بچھے ہوئے تھے جو سورج کی چمکانے والی کرنوں میں یوں جگمگ جگمگ کر رہے تھے جیسے کسی بازیگر نے صحنِ گلشن میں نیلم، پکھراج، زردے اور ہیرے کے ننھے ننھے ٹکڑے بکھیر دیئے ہوں مگر پرویز ان سے بالکل محظوظ نہیں ہوا۔ وہ اپنے تصوّرات میں اُلجھا ہوا اقامت گاہ کی جانب بڑھنے گیا۔

جب وہ خیمے کے پاس پہونچا تو اُس نے باغ والے سُرخ مکان کو مڑ کر دیکھنے کی کوشش کی مگر ناکام رہا۔ البتہ اُس نے یہ دیکھا کہ ساری وادی ایک جام کی مانند معلوم ہوتی ہے اور اس میں نورِ آفتاب آتشِ سیال کی طرح چھلک رہا ہے۔ پھر اُس نے آسمان کی طرف نظر کی۔ خورشید کی کسی کرن کی زد میں بادل کا ایک

سفید ٹکڑا، جس کی ہیئت چھوٹے سے پرند کی تھی، اُس سے بچکر بھاگنے کی کوشش کر رہا ہے۔ کرن چند ساعت کے لئے ایک اور مستطیل نما بادل میں چھُپ گئی اور پھر جو نمودار ہوئی تو اُس کے ہمراہ کئی کرنیں تھیں۔ اُنہوں نے مل کر پھر اُسی پرندے کا پیچھا کیا، جیسے کوئی صیّاد اُسے اپنے جال میں گرفتار کر لینا چاہتا ہو، اور عین اسی وقت کہیں سے ایک آوارہ سحاب جو ذرا بڑے پرند کی مانند تھا، تیزی سے آگے بڑھا اور اس چھوٹے سے پرند کو اپنی آغوش میں لیتے ہوئے نیچے کی طرف غوطہ دیکر، آگے بڑھ گیا ——— پرویز نے بادلوں کے اس ڈرامے کو بڑی دلچسپی سے دیکھا اور جیسے اُسے کوئی روشنی دکھائی ہو، وہ کچھ سوچتا ہوا خیمے میں داخل ہو گیا۔

روزِ روشن کی عمر ہی کیا؟ صرف چند گھنٹے! نیّرِ مشرق کے نصف النہار سے گذرتے ہی اسکی آب و تاب میں انحطاط پیدا ہو گیا اور سورج مکھی کا کٹورا سا پھول اپنے محبوب کی دید کیلئے متواتر اپنا رُخ بدلتا رہا۔ آخر کار جب وہ بحرِ مغرب میں کائنات کو گلابی رنگ میں رنگتا ہوا ڈوب گیا تو سورج مکھی کسی مایوسِ محبت کی طرح پژمردہ و افسردہ ہو گئی۔ ابابیلوں کی پرواز نے آمدِ شب کا اعلان کیا اور رات کی رانی اپنی بھینی بھینی خوشبو سے فضائے عالم کو ایک نئی تازگی، ایک نئی شادابی، ایک نیا روپ عطا کرنے لگی۔

پھر آسمان پر چاند نکل آیا اور پروردۂ ماہتاب پھول بصد ناز و انداز ہوا کے جھونکوں سے اٹھلانے لگے۔ خیمے کے بالائی جالی دار دریچے سے نکہت بیز چاندنی، دریا کے دھارے کی طرح اندر آ رہی تھی اور پرویز وائلن کے زیریں حصّے پر اپنا رخسار ٹکائے اُسکے بجانے میں محو تھا۔ اس کے دائیں ہاتھ میں سفید نرم بالوں کا گز ماہرانہ انداز میں چل رہا تھا، اور بائیں ہاتھ کی انگلیاں، وائلن کے چاروں تاروں پر اسقدر ماہرانہ چابکدستی سے ناچ رہی تھیں گویا وہ موسیقی کی دیوی کو متشخّص کر کے رُوئے

زمین پر بلا لینا چاہتا ہے. اس ساز سے جو نغمے نکل رہے تھے اُن میں سحر کا سا اثر تھا اور وہ اس میں اس قدر مدہوش تھا کہ اُسے خبر بھی نہیں ہوئی کہ نغمانہ کب خیمے کے اندر آئی اور کب سے وہ اس کی موسیقی سے متاثر و متحیر ایک کونے میں ساکت کھڑی ہے. اچانک وائلن کا باریک تار، ایک مہین سی چیخ کے ساتھ ٹوٹ گیا. وہ خوابِ موسیقی سے چونکا، اور اس شعلہ رُو کو خیمے میں دیکھ کر بے ساختہ اُسکے مُنہ سے نکلا، "نغمانہ!"

نغمانہ نے چند لمحات اُسے خمار آلود نگاہوں سے دیکھا. پھر جیسے جاگ کر، وہ اسکے قریب آ گئی اور عاجزی سے کہنے لگی "مجھے معاف کر دیجئے ___ میری وجہ سے صبح آپ کی بڑی توہین ہوئی!"

پرویز نے کوئی جواب نہیں دیا. اور اُس کی پُر اشتیاق نگاہیں نغمانہ کی سبز اور خوبصورت آنکھوں پر جم گئیں.

اُسے یوں خاموش دیکھ کر وہ پھر بولی: "میں جانتی ہوں کہ توہین کا زخم کس قدر گہرا ہوتا ہے. اس لئے مجھے احساس ہے کہ دِل میر کی سخت کلامی سے آپ کو کس قدر تکلیف ہوئی ہو گی ___ اور آپ کی یہ توہین میری وجہ سے ہوئی. میں آپ سے اُسی کی معافی مانگنے آئی ہوں"

پرویز نے اُس کا ہاتھ آہستہ سے پکڑ کر، اُسے اسٹریچر پر بٹھا دیا اور خود فرش پر بیٹھا رہا. نغمانہ کی نظروں سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ پرویز کا جواب سننے کی منتظر ہے. وہ جاننا چاہتی ہے کہ آیا وہ درگذر کر سکتا ہے یا نہیں. اُسے اس قدر حساس اور منتظر دیکھ کر پرویز نے آہستگی سے کہا: "مجھے واقعی صبح اذیت ہوئی اور میں دن بھر اسی اُلجھن میں رہا کہ کیا اس وادی میں، میں یہ گھاؤ کھانے کے لئے آیا تھا؟"

"آپ سیاح ہیں"، نغمانہ نے یہ اس طور سے کہا جیسے وہ اُسے سمجھا رہی ہو۔ "چند روز بعد آپ یہاں سے چلے جائیں گے. لیکن میرے دل میں ہمیشہ یہ خلش رہے گی

کہ میری وجہ سے آپ کی توہین ہوئی۔ یقین مانیئے مجھے اس کا بیحد رنج ہے۔ اسی لئے شام کو وہ اپنی کشتی میں کہیں چلا گیا تو میں آپ کے پاس معذرت کرنے چلی آئی۔ آپ اس کا کچھ خیال نہ کیجئے۔ وہ تو اپنی عادت سے مجبور ہے۔"

پرویز اُسے یوں گویا دیکھ کر بیقرار ہو گیا اور اُس کے دل میں یہ خیال اچھی طرح بس گیا کہ اس معصوم چڑیا کو کسی صیاد نے قفس میں بند کر دیا ہے۔ اسے پر پھڑپھڑانے کی بھی اجازت نہیں، اور یکایک اُس نے سوال کیا: "مجھے بتا دیجئے کہ وہ شخص کون ہے۔۔۔ کیا وہ آپ کا شوہر ہے؟"

نغمانہ نے گردن جھکا لی اور آہستگی سے بولی: "میری اُس سے ابھی تک شادی نہیں ہوئی۔ مگر وہ کہتا ہے کہ بچپن میں اُس سے میری منگنی ہو چکی ہے۔"

پرویز تھوڑا سا آگے سرک آیا: "لیکن وہ گھر تو شاید اُسی کا ہے۔ آپ اپنے والدین کے ساتھ نہیں رہتیں؟"

نغمانہ کی آواز میں اُداسی جھلک آئی اور وہ اس طرح باتیں کرنے لگی گویا آج عمر میں پہلی بار کسی نے اُس سے دلی ہمدردی ظاہر کی ہے اور وہ اس کو سب کچھ بتا دینے میں بالکل نہیں جھجکتی۔ اُس نے کہا: "میرے ماں باپ کا انتقال ہو گیا ہے۔ باپ کی شکل میں نے نہیں دیکھی اور ماں اُس وقت اللہ کو پیاری ہوئی جب میں سات آٹھ سال کی تھی۔ یہ باغ والا سُرخ مکان ہمارا ہی ہے لیکن میری ماں کے مرنے کے بعد دل میر کے باپ نے اس پر اور ہمارے کھیتوں پر قبضہ کر لیا۔ میری ماں کے پاس زر و جواہر کے بڑے خوبصورت زیور تھے، وہ بھی اُس نے لے لئے۔ مگر وہ مجھ کو بیحد چاہتا تھا۔ اپنی بیٹی کی طرح اُس نے میری پرورش کی اور جب تک وہ زندہ رہا مجھے کوئی دُکھ نہیں پہنچا۔ ابھی چند مہینے ہوئے کالی پہاڑی پر سے گر کر وہ مر گیا اور اس وقت سے اس کا یہ بیٹا دل میر مجھے دق کیا کرتا ہے۔ اِسکے

لچھن اچھے نہیں ہیں۔ تجارت کے لئے یہ آئے دن جزیروں میں جایا کرتا ہے اور لوگ کہتے ہیں کہ وہاں یہ آوارگی کرتا ہے۔"

پرویز نے نیم وا آنکھوں سے خیمے کے باہر دیکھتے ہوئے نہایت رسان سے پوچھا "تو آپ اس سے شادی کریں گی"۔

نغمانہ نے ٹھنڈا سانس بھرا اور اس لہجے میں جس سے مجبوری ظاہر ہوتی تھی، جواب دیا۔ "شاید اور کوئی چارہ بھی نہیں۔ لیکن مجھے اُس سے نفرت ہے۔ جب تک اس کا باپ زندہ تھا، اس میں پھر بھی کبھی کبھی آدمیت آجاتی تھی۔ وہ مجھے اپنے ساتھ کبھی کبھی کشتی کی سیر کرانے لے جاتا تھا۔ اُس نے مجھے ناؤ کھینی بھی سکھائی۔ ایک دفعہ کوئی خانہ بدوش قبیلہ ہماری وادی میں آیا۔ اس میں ایک رقاصہ تھی جو دیئے کی لَو کی طرح یوں ناچتی تھی جیسے پاؤں زمین پر ٹکتے ہی نہیں۔ اس کا ایک ساتھی پتھروں کے دو چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں سے اس کی سنگت کیا کرتا تھا اور ان پتھروں کی چٹ چٹ، چٹاچٹ، چٹاچٹ، اس کے ناچ اور ایک دوسرے ساتھی کے ستار کے ساتھ ملکر بڑی کیفیت پیدا کرتی تھی۔ مجھے یہ بیحد پسند آیا اور میری خواہش پر دل میر نے اُس خانہ بدوش رقاصہ سے طے کر کے مجھے اس کا ناچ بھی سکھایا۔ وہ آپ کی طرح وائلن بڑا اچھا بجاتا ہے۔ چنانچہ بارہا ایسا ہوا کہ دل میر وائلن پر ناچ کی گت بجاتا یا پتھر کے ٹکڑوں سے سنگیت کرتا اور میں ناچتی۔ گھنٹوں اسی طرح گذر جاتے تھے۔ مگر اب باپ کے مرنے اور جزیروں کی آوارگی نے اُسے بڑا بد اخلاق بنا دیا ہے۔ وہ اب شراب بھی پیتا ہے اور اسکے منہ میں گالیاں بھی پڑ گئی ہیں"۔

پرویز بولا۔ "صبح وہ آپ کے ساتھ جس بدتمیزی سے پیش آیا اُسے تو کسی کی محبت برداشت نہیں کر سکتی"۔

نغمانہ غمناک آواز میں کہنے لگی۔ "اس کی انہی باتوں سے تو مجھے اس سے نفرت

ہوگئی ہے۔ وہ مجھے اپنی زرخرید لونڈی تصور کرتا ہے۔ وہ جانتا ہے کہ میری تمام مِلک اپنے قبضے میں کرکے اُس نے مجھے بالکل محتاج کردیا ہے۔ مجھے سر چھپانے کا بھی کہیں آسرا نہیں۔ ایک دن وہ اُرن سے واپس آیا تو وہ نشے میں تھا۔ اُس نے مجھے کھینچکر زبردستی اپنے سینے سے لگالیا اور میں نے اُس کی نظروں سے ڈرکر جب مدافعت کی تو اُسنے میرے بازو کو پیار کیا اور جوش میں اپنے دانت اس میں پیوست کر دیے۔ اُسوقت سے میں اُس سے ہمیشہ بچنے کی کوشش کرتی ہوں جس کی بنا پر مجھے طرح طرح کی سزا دی جاتی ہے۔ کبھی وہ مجھے سخت سُست کہتا ہے، کبھی خواہ مخواہ گالیاں دیتا ہے۔ کبھی کھانے پینے کی بھی پابندی کر دیتا ہے۔" نغمانہ کی آواز گلوگیر ہوگئی " کل وہ کہنے لگا، اگر تو یونہی نخرے کیا کرے گی تو میں تجھ سے شادی نہیں کرونگا بلکہ تجھے داشتہ بنا کر رکھونگا۔ اس سے میرے تن بدن میں آگ لگ گئی اور میں نے اُس سے ہمت کرکے کہا کہ میں تمہیں جان سے مار ڈالوں گی۔ اس پر وُہ بپھر گیا اور یہ کہکر کہ "بڑی آئی کہیں سے پارسا!" اُس نے میرا سینہ بند گھسیٹ کر پھاڑ ڈالا۔ میں بھاگ کر دوسرے کمرے میں آگئی اور میں نے اندر سے دروازہ بند کرلیا۔ پھر جب وہ کہیں چلا گیا تو میں اُس پہاڑی کی چوٹی پر چلی گئی۔ مجھ سے اس قدر بے عزتی اور اسقدر ذلّت برداشت نہیں ہوسکتی۔ اسی لیے میں نے چاہا تھا کہ اپنا خاتمہ کرلوں، مگر آپ ـــــ"

"تو آپ وہاں اسی لیے خودکشی کرنے پہونچی تھیں؟" پرویز نے ہمدردانہ لہجے میں پوچھا اور جب دیکھا کہ جواباً نغمانہ کی آنکھیں ـــــ سبز اور خوبصورت آنکھیں ـــــ اشکبار ہوگئی ہیں تو اُس سے نہ رہا گیا اور اُس نے بے اختیار ہوکر کہا۔" اس دنیا میں ہر شخص کو کوئی نہ کوئی دُکھ ضرور ہے۔ کسی کا رنج قابلِ برداشت ہوتا ہے اور کوئی زخموں سے بالکل ہی چُور ہے۔ لیکن غم کو زیادہ اہمیت

نہیں دینی چاہیئے۔ زندگی کی آندھی میں ثابت قدم رہنا انسان کا فرض ہے۔ نغمانہ تمہاری طرح میں بھی غم نصیب ہوں۔ لیکن تمہارے دُکھ نے تمہیں زندگی سے بیزار کر دیا ہے اور میں اپنے رنج کو سیر و سیاحت کے بہانے بھولنے کی کوشش کیا کرتا ہوں۔"

نغمانہ بے ساختہ بول اٹھی "ٹھیک ہے۔ میں نے پہلی ہی بار آپ کی نظروں کی اُداسی سے اندازہ لگا لیا تھا کہ آپ بھی الم رسیدہ ہیں۔ آپ نے میری تو رام کہانی سُن لی، کیا آپ مجھے اپنا دُکھ نہیں بتائیں گے؟"

پرویز نے نغمانہ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالدیں اور ہولے ہولے اُسے اپنا فسانۂ حیات سنانے لگا۔ رعنا کی محبت اور وفاشعاری کا ذکر کرتے کرتے اُس کی آواز بھرا گئی۔ پھر اُس نے خوش کرنے کے لئے اُن جزیروں اور وادیوں کا حال، جن کی اُس نے پچھلے دنوں سیاحت کی تھی، اُسے ایسے دلکش پیرائے میں سُنایا جیسے واشنگٹن ارونگ الحمرا کے دلفریب افسانے بیان کر رہا ہو یا وارث ڈیٹینگ حسن و رومان کی کوئی محیرّ کن داستان سنائے۔

نغمانہ اُس کی باتیں نہایت غور سے سنتی رہی اور اُس کے تخیّل پر رعنا کا اَن دیکھا سراپا چھا گیا۔ وہ اس کی غائبانہ تعریف کرنے لگی اور پرویز سے ہمدردی کرتے ہوئے بولی "اتنی اچھی خاتون کی رفاقت سے محروم ہو جانا واقعی رنجدہ ہے اور آپ کو اس کا جتنا بھی قلق ہو کم ہے۔ میں نے اُنہیں کبھی نہیں دیکھا مگر میرا دل کہتا ہے کہ وہ ضرور غیر معمولی صفات کی خاتون ہونگی۔ میرا تصوّر اُن کا نہایت پاکیزہ پیکر بناتا ہے اور میں دیکھتی ہوں کہ وہ دُبلی پتلی اور نازک اندام ہیں، مگر اُن میں سہار اور استقلال کی زبردست قوتیں موجود ہیں۔ ان کو بالعموم غصّہ نہیں آتا اور وہ ہر شخص کی خدمت پر آمادہ ہیں۔ وہ ہنس مکھ ہیں اور چاہتی ہیں

کہ کسی کو اُن سے کوئی شکایت نہ ہو۔۔۔۔۔۔"

پرویز کی آنکھیں پُرنم ہو گئیں اور اُس کے مُنہ سے بے ساختہ نکلا"۔۔۔۔۔ یہ حرف بحرف صحیح ہے۔ اُن میں ایسے ہی محاسن تھے اور آپ کچھ اور نہ سمجھیں تو ایک بات کہوں ــــ"

نغمانہ نے اس پر مستفسرانہ نظر ڈالی، گویا وہ کہہ رہی ہے "آپ کہتے کہتے کیوں رُک گئے؟ کہے جائیے"

اور پرویز نے کہا "میں یہ کہنا چاہتا تھا کہ آپ رعنا کی ہم شکل ہیں، اور مجھے آپ میں اُنکی بہت سی خوبیاں نظر آتی ہیں"

ــــ یکایک کشتی میں ملّاح نے اپنی پرزور آواز میں لہک لہک کر گانا شروع کر دیا، اور نغمانہ چونک کر کھڑی ہو گئی "اب میں جاتی ہوں" اور خیمے میں سے نکلتے ہوئے وہ بولی "میں بیان نہیں کر سکتی کہ آپ سے مل کر مجھے کس قدر مسرت ہوئی ہے۔ اس کے علاوہ آپ نے مجھے ایک اور چیز عطا کی ہے، اور وہ ہے عزم! میں اب زندگی کی آندھیوں سے بچ نکلنے کی سعی کروں گی اور رنج و غم بگولے کے ذروں کی طرح میرے لیے حقیر و بے معنی ہو جائیں گے"

پرویز اُسے دُور تک پہونچانے گیا۔ راستے میں اُس نے پوچھا "دل میر کب واپس آئے گا؟"

نغمانہ نے جواب دیا "کچھ ٹھیک نہیں ہے۔ عام طور پر آٹھ دس روز تو لگ ہی جاتے ہیں ــــ اچھا، اب آپ بہت دُور آ گئے۔ میں یہاں سے اکیلی جاؤں گی۔ خدا حافظ!"

پرویز اُسے الوداع کہنے سے پہلے پھر بولا "آپ نے میرے پاس آنے کی تکلیف اٹھائی۔ میں اس کا شکر گذار ہوں، اور ــــ میری جسارت کو معاف کیجئے۔ میں

آپ کے پاس کل صبح آؤنگا۔ آپ ملیں گی؟"

نغمانہ ایکا ایکی خاموش ہوگئی اور کچھ سوچ کر بولی: "انکار کرنے کو میرا دل نہیں چاہتا، لیکن آپ وہاں نہ آئیے۔ میں خود ہی آپ کے پاس آؤنگی۔"

علی الصباح وہ بیدار ہوگیا۔ تمام وادی میں جیسے کسی نے جلوے اور سائے، نور اور ظلمات، روشنی اور تاریکی کو آپس میں حل کر کے بکھیر دیا تھا۔ اور اُس سمت میں، جہاں اگلے وقتوں کی ایک ٹوٹی پھوٹی خانقاہ تھی، گلِ چاندنی کے پستہ قد درخت دُور دُور تک سفید برّاق قباؤں کی طرح لہرا رہے تھے۔ پرویز اسی طرح چہل قدمی کے لئے چل کھڑا ہوا۔ وہ چلتے چلتے سوچتا تھا کہ اس وادیِ نشین، اس جلوہ زارِ فطرت، اس شبستانِ نغمہ وگل کے مطالعہ کا کوئی خاص وقت معیّن نہیں ہے۔ آمدِ صبح، طلوعِ خورشید، روزِ روشن، غروبِ آفتاب، نورِ ماہ، تاروں کی چھاؤں، غرض لمحے اور ہر ساعت یہاں قدرت مسکراتی ہے، گنگناتی ہے۔ گلابی شفقی پہاڑیاں، اخضری نیلمیں گھاٹیاں، شوریدہ سر موجیں، آئینہ ساماں جھرنے، گوہر بار فوارے، لاجوردی آسمان اور اس کے چمکنے دمکنے والے ستارے، المختصر یہاں کی ہر شئے قابل دید ہے۔ ہر چیز لائقِ داد ہے۔

خانقاہ کی شکستہ دیواروں اور بوسیدہ محرابوں کو دیکھکر اس کے بحرِ تخیّل میں گرداب پڑنے لگے اور وہ سوچنے لگا' یہاں کیسے کیسے بوریا نشیں زہد و عبادت میں مصروف رہے ہونگے۔ اُنہوں نے دُنیا اور اس کی رنگینیوں سے منہ موڑ لیا ہوگا۔ تمام آرام و آسائش کو تج دیا ہوگا۔ ہاتھ کے تکیئے اور خاک کے بستر میں مگن رہتے ہونگے۔ انہیں کسی بات کا رنج نہ ہوگا۔ کسی چیز کا غم نہ ہوگا۔ بس اُن کے دل میں ایک ہی لگن ہوگی۔ ایک ہی چیٹک ہوگی کہ اپنے مالک سے لَو لگائے رہیں اور اُسکی

خوشنودی حاصل کرنے کے لئے ساری عمر پرہیز گاری میں گذار دیں۔ اُن کا یہ ایمان ہوگا کہ زندگی کے آخری سانس تک اُس کی تسبیح و ثنا کرتے رہیں، تب بھی اپنے رب کی نعمتوں کا، جن سے اُس نے ہم کو سرفراز فرمایا، شکریہ ادا نہیں کر سکتے۔ اور اسی راسخ عقیدے میں محو ہو کر وہ سالہا سال اسی خانقاہ میں بسر کر دیتے ہوں گے۔ بیشک اُن کے دلوں میں خلوص اور صداقت ہوگی اور وہ روحانی لطف و انبساط کی خاطر ہر شے قربان کر دیتے ہونگے .... لیکن کیا یہ واقعی عقلمندی ہے؟ کیا خدا سچ مچ مسلسل عبادت سے، اس عبادت سے جو اپنے انسانی فرائض سے غافل اور منکر ہو کر کی جائے، خوش ہوتا ہے؟ کیا زندگی کا یہ مقصد جائز قرار دیا جا سکتا ہے کہ انسان اس دائرے سے جان چھڑا کر جو کچھ فرائض اور دوسروں کے حقوق عائد کر دے، کوئی گوشۂ تنہائی جا بسائے؟ اور کیا اس قسم کے عقائد انسان کو بزدل نہیں بنا دیتے؟ جوانمردی تو یہ ہے کہ عبودیت کے ساتھ ساتھ اپنے فرائض کو بھی پورا کیا جائے اور علائق زندگی کا مردانہ وار مقابلہ کیا جائے۔ جسمانی ضرورتوں کو، محض مادیت کا خطاب دیکر تو نظر انداز نہیں کر دینا چاہیئے۔ ورنہ پھر اس عالمگیر آبادی کی ضرورت ہی کیا تھی؟ کیوں نہ ہر شخص کے لئے ایک الگ دُنیا پیدا کر دی گئی تا کہ کسی کو کسی سے سروکار نہ ہوتا۔ کسی کے کوئی حقوق نہ ہوتے۔ فرائض نہ ہوتے۔ بس انسان ہوتا اور خالق کی عبادت۔ پھر تو جہنّم کے بنانے کی بھی ضرورت پیش نہ آتی اور موت کا تخیّل کسی کے لئے اذیّت کوش نہ ہوتا۔ زندگی سے ہر فرد کو نفرت ہو جاتی اور وہ ہنسی خوشی مر جاتا۔ شاید بہراسیری مقبولِ عام ہو جاتی کہ جسم اور رُوح کی کشمکش سے فوراً نجات مل جائے۔ جلدی سے جلدی گراں باریٔ حیات کے عوض ابدیت اور الوہیت حاصل ہو جائے۔ شاید یوں قطرات پل بھر میں سمندر میں جا ملتے۔ اجزا زیادہ سرعت سے کُل میں جذب ہو جاتے اور فنا بقا کا درجہ پالیتی۔

...... اور اس کے دل نے کہا: "یہ تم کہاں سے کہاں جا پہونچے؟ حیات و ممات اور کفر و عبادت پر تنقید اتنی آسان تو نہیں۔ تم اس جھگڑے میں نہ پڑو۔ یہ تمہارے بس کی بات نہیں۔ تم تو یہ دیکھو کہ اس خانقاہ کی بارہ دری میں پھولوں کی ساخت کیسی ہے؟ ان پھولوں کی شکل و صورت گنبد و مینار جیسی کیوں ہے؟ کہیں یہ اُن پاک صورتوں کے عکس تو نہیں جو عبادت کرتے کرتے خاک میں پنہاں ہو گئیں؟"

پرویز سیر سے واپس آیا تو نغمانہ اس کے انتظار میں بیٹھی ہوئی تھی۔ اُن دونوں کے لبوں پر، ایک دوسرے کو دیکھکر تبسّم آگیا، وہ تبسّم جو سچی خوشی کا مظہر ہوتا ہے۔ تصنّع اور دنیاداری کا نمائندہ نہیں۔ نغمانہ ایک ٹوکری میں اس کے لئے چیسٹ نٹ اور لال سبز کیلے لائی تھی۔ پرویز نے اس تحفے کی بڑی قدر کی خصوصاً چیسٹ نٹ اور لال کیلے نہایت شوق سے کھائے۔ اسکے جانے سے پہلے اُس نے اسٹو جلایا اور ہورلکس کا خشک دودھ ملا کر اس کیلئے سبز چائے بنائی۔ نغمانہ نے اسے بیکولائٹ کی پیالی میں پیا اور اسکے مزے سے بیحد خوش ہوئی۔

پھر وہ اس کے پاس روزانہ آنے لگی صبح، دوپہر یا شام۔ ایک آدھ دفعہ رات کو بھی وہ اُس کے پاس آئی اور اُس نے دیکھا کہ پرویز ہمیشہ اس کا منتظر رہتا ہے۔ راستے میں کسی ٹیلے پر بیٹھ کر یا کسی درخت کا سہارا لئے اس کا انتظار کیا کرتا ہے۔ اور جب وہ اُسے دیکھ لیتا ہے تو گویا اُسے کوئی نعمت مل جاتی ہے۔ اسکے چہرے سے بشاشت ٹپکنے لگتی ہے اور وہ اُس سے اس طرح ملتا ہے جیسے وہ اُسے عرصہ دراز سے جانتا ہے۔ اُسے اچھی طرح پہچانتا ہے۔ پھر اُن دونوں میں گھنٹوں باتیں ہوتی رہتیں اور وہ دُور دُور تک سرگوشیاں کرتے ہوئے چلے جاتے۔

ایک روز صبح وہ خانقاہ والی ڈھلان کے دامن میں ساحل پر آگئے۔ سمندر کی چمکیلی سطح پر موجیں ناچ رہی تھیں اور ذرا فاصلے پر ماہی گیر اپنے جال پھیلائے

مچھلیاں پکڑ رہے تھے۔ نغمانہ ماہی گیروں کو اپنی طرف متوجہ دیکھ کر ذرا گھبرا سی گئی اور جلدی جلدی قدم بڑھاتی ہوئی، سامنے والی لمبوتری چٹان کے پیچھے چلی گئی۔ وہاں پہونچ کر اُسے اطمینان معلوم ہوا اور تنہائی کے اس خوبصورت ماحول میں، اُس نے پرویز کو سمندر کا وہ حصہ دکھایا جو چٹان اور ساحل کی گولائی سے حلقہ سا بن گیا تھا۔ اس کی سطح آئینے کی مانند صاف و شفاف تھی اور دُور دُور سے آنیوالی موجیں یہاں تک پہونچتے پہونچتے خرام پسند دائروں میں تبدیل ہو جاتی تھیں۔ ان دائروں کی آغوش میں رنگ برنگی مچھلیاں تیر رہی تھیں۔ ان کے وضع وضع کے قد و قامت، ان کی عجیب و غریب شکلیں اور اُن کے عجیب تر رنگ ایک انوکھا منظر پیش کرتے تھے۔ اس قسم کا حیرتناک تماشہ اُس نے بس ایک دفعہ مدراس کے (Aquarium) میں دیکھا تھا جہاں رات کو بجلی کی روشنی میں دلفریب اور مختلف النوع مچھلیاں، دھنک کے رنگوں کی طرح اپنی بہار دکھاتی ہیں۔ نغمانہ نے ایک پتھر پر بیٹھ کر اپنے پاؤں پانی میں ڈال دیئے۔ اور رنگ برنگی چکنی مچھلیاں، نازک ادا چلبلی پریوں کی مانند کبھی اس کی خوبصورت ہلتی ہوئی پنڈلیوں سے ڈر کر بھاگ جاتیں اور کبھی ان کو ساکت دیکھکر اور اُن کو اپنے ہی جیسے دو ماہ پارے سمجھ کر اُن سے آلپٹتی تھیں۔ پرویز بہت دیر تک مچھلیوں کے اس خواب آور مشغلے اور نغمانہ کی سراپا جمال پنڈلیوں کو دیکھتا رہا اور سوچتا رہا کہ ان پنڈلیوں کی نازک اور سفید جلد میں سے خون کی لالی اس طرح لہراتی ہے جیسے مینا بے بلوریں میں چھلکتی ہوئی شراب ناب۔

یکایک نغمانہ بولی "آیئے تیریں"۔

پرویز کی طبیعت سمندر کے شوریلے پانی میں غسل کرنے کو اکثر چاہتی تھی مگر وہ تیرنا نہیں جانتا تھا۔ نغمانہ کو پانی میں اُترتے ہوئے دیکھکر اس نے فوراً کہا "مجھے

تیرنا نہیں آتا۔ آپ تیریئے"

نغمانہ واپس آ گئی اور اس کا ہاتھ پکڑ کر کہنے لگی "تو ہم یہیں کنارے پر رہیں گے۔ آئیے تو سہی، موجوں کے ہلکوروں میں بہت لطف آتا ہے"

نغمانہ کے اصرار سے وہ راضی ہو گیا۔ اس نے اپنی خاکی قمیص اتار دی اور نکر پہنے پہنے، اس کے سہارے سمندر میں اتر گیا۔ اسے اس پر اس قدر بھروسہ تھا کہ بے دھڑک اس جگہ تک پہونچ گیا جہاں گھٹنوں سے اوپر پانی تھا، اور جب از راہِ مذاق نغمانہ نے اس کا ہاتھ چھوڑ دیا تو پرویز کو ایسا معلوم ہوا کہ پانی کے زور نے اس کے پاؤں کے نیچے سے زمین سرکا دی ہے، اور وہ یوں بے سہارا ہو کر گرنے لگا ــــــ مگر نغمانہ نے ہنستے ہوتے اسے تھام لیا اور کہنے لگی "قدم جمائے رکھیے۔ یوں! آئیے، ذرا اور آگے چلیں۔ وہاں موجوں کا خوب زور ہے"

پرویز کچھ ڈرتا، کچھ نغمانہ کی معیت میں ایک نیا کیف محسوس کرتا کمر کمر تک پانی میں چلا گیا۔ ایک بڑی اونچی موج آئی۔ پرویز خوفزدہ ہو گیا اور جب موج کا شامیانہ اس کے اوپر چھانے لگا تو اس کے منہ سے چیخ نکل گئی مگر دفعتاً نغمانہ نے اس کی کمر میں حلقہ ڈالکر اسے تھوڑا سا اچھال دیا۔ موج اوپر سے گذر گئی اور اس اچھلنے میں اسے بے حد لطف آیا۔ وہ دونوں ایک دوسرے کو دیکھکر کھلکھلا کر ہنس پڑے۔ تو یہ ہیں موجوں کے ہلکورے! ایک اور موج آئی اور پھر نغمانہ نے اس کی کمر تھام کر اشارہ کیا۔ اس دفعہ اس کی مدد سے کم اور اپنی قوت سے زیادہ وہ خود اچھلا۔ موجیں لگاتار آتی رہیں۔ نغمانہ ہر بار اسے سہارا دیدیتی۔ اور وہ دونوں شوریدہ سر موجوں کی گود میں اچھلتے کودتے رہے۔ تھوڑی دیر بعد پرویز کو تھکن سی محسوس ہونے لگی اور وہ نغمانہ کا ہاتھ پکڑے کنارے کی طرف واپس آیا۔ اور جب پانی گھٹنوں تک رہ گیا تو نغمانہ نے اس کا ہاتھ چھوڑ کر اس پر پانی اچھالنا شروع کر دیا۔ وہ کبھی بچنے کی کوشش کرتا، کبھی خود پانی ہاتھوں میں لیکر

اس پر پھینکنے لگتا، اور اس کشمکش میں وہ لڑکھڑا گیا۔ نغمانہ نے فوراً اُسے سنبھالا اور اپکے اس کے ہاتھ اس طرح اس کے گرد حمائل ہوئے کہ پرویز اس کی آغوش میں آگیا۔ اُس کے گورے گورے بازو، اس کے اُجلے بدن سے چمٹ گئے اور اُس کی پُشت کا بالائی حصّہ اور سر نغمانہ کے سینے سے آلگا۔ اور اس لمحے اُن دونوں کو ایسا محسوس ہوا کہ وہ محض فطرت کے معصوم کھلونے نہیں بلکہ جذبات سے پُر مرد و عورت ہیں۔ اُن میں غیریتِ جنسی ہے۔ اُنکے جسموں میں خون موجوں کی طرح مضطرب ہے۔

نغمانہ اُس سے علیحدہ ہو گئی اور جلدی جلدی اُسے سہارا دے کر پانی سے باہر نکل آئی۔ پھر وہ دونوں سمندری ریت پر بیٹھ گئے اور نغمانہ اپنے بھیگے ہوئے بالوں کو دُرست کرنے لگی۔ اس وقت، اس کے شیشے کی طرح مصفّا جسم اور سیاہ زلفوں کا یہ عالم تھا کہ ؎

وہ گورا بدن اور بال اُسکے تر کہے تو کہ ساون کی شام و سحر

اُس گلاب کی طرح جو جوشِ نمو میں انتہائی دلفریبی اور رعنائی کے ساتھ کھِل جائے۔ قمرِ چار دہم اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ نمودار ہو گیا۔ اُس کی اُجلی اور پاکیزہ شعاعیں سمندر کی موجوں میں مدوجزر پیدا کرنے لگیں اور لہلہاتے ہوئے برگ و گل، نخلستانی جزیروں کی عشرت سراؤں کی طرح آسائشِ دل فراہم کرنے لگے۔ نغمانہ رات کو آنے کا وعدہ کر کے صبح ساحل سے رخصت ہو گئی تھی۔ پرویز اُسی کے انتظار میں خیمے کے اندر بے چین بیٹھا ہوا تھا۔ وقت گذارنے کے لئے اُس نے وائلن کا کیس کھولا اور چوکور لفافے میں سے ایک نیا باریک تار نکال کر اس کا ٹوٹا ہوا تار بدلا۔ پھر وہ گز کو بروزے پر ملنے لگا کہ معاً وہ مرکزِ خیال، وہ محبوبۂ تصوّر، وہ دخترِ شبِ ماہ، سرخ کپڑوں میں ملبوس ایک نازک تخیّل کی مانند شاعرانہ انداز میں

اندر داخل ہوئی۔ اُس کی بیچ میں نکلی ہوئی مانگ اُسکے صحیفہ جمال کا گویا نقشِ اوّلیں تھی۔ اس کے گھنے دراز بال دو سیاہ چوٹیوں میں گندھے ہوئے اُسکے شانوں پر مچل رہے تھے۔ اس کا روئے نگاریں عصمت کے کنول کی طرح معصومیت اور حسنِ بے پناہ کا پاسدار تھا۔ اُس کی صراحی دار گردن میں لٹکی ہوئی ایک ننھی سی الماس نما سیپ ایسی معلوم ہوتی تھی جیسے ماہتاب کے قریب ستارۂ ثریا چمک رہا ہو۔ اور اُس کا سُرخ پوش جسم یاقوتِ تراشیدہ کی طرح دُنیائے حُسن وجمال کا انمول رتن معلوم ہوتا تھا۔

پرویز چند لمحات کچھ نہ بول سکا۔ چپ چاپ اُسے تکنے گیا۔ کوئی پُراسرار آواز کہہ رہی تھی۔ "ہاں اے دل! اے دل! یہ بارگاہِ حُسن ہے۔ یہ آستانِ عصمت ہے۔ یہاں سجدۂ عشق جائز ہے۔ یہاں نذرِ عقیدت روا ہے۔"

نغمانہ آگے بڑھ آئی اور مسکراتے ہوئے کہنے لگی۔ "آیئے باہر چلیں۔ وائلن بھی لے چلیئے۔"

خیمے سے نکل کر اُس نے بھولپن سے اپنا ہاتھ اُس کے ہاتھ میں دیدیا اور وہ ایک گوشۂ تنہائی کی طرف مُڑ گئے۔ تھوڑی دور جا کر وہ ٹھیرے اور پرویز الائچی کے ایک شگوفہ بار درخت کا سہارا لیکر بولا۔ "آپ میری ایک درخواست منظور کریں گی؟"

نغمانہ نے بیٹھتے ہوئے جواب دیا۔ "نہایت خوشی سے ـــ فرمایئے!"

"وہ ناچ! جو آپنے خانہ بدوش رقاصہ سے سیکھا تھا!"

نغمانہ کے لبوں پر ایک دلکش تبسّم آگیا اور وہ ذرا شرما کر بولی۔ "پہلے آپ یہیں وائلن پر کوئی گانا سُنایئے۔" اور جب اُس نے زیادہ ضد کی تو پرویز مجبور ہو گیا اور اُس نے بغیر گز کے وائلن کے تاروں کو دائیں ہاتھ کے انگوٹھے اور بائیں ہاتھ کی اُنگلیوں سے چھیڑنا شروع کیا۔ کچھ دیر میں فضا مدھ بھری ہو گئی تو اُس نے نہایت

آہستہ آہستہ جوش کی نظم کے یہ اشعار سنائے :-

اے نرگسِ جاناں! یہ نظر کس کیلئے ہے؟ یہ شعلہ، یہ بجلی، یہ شرر کس کے لئے ہے؟
اے زہرہ جبینوں کیلئے پیکِ ہزیمت پیغامبرِ فتح و ظفر کس کے لئے ہے؟
اے تجھکو ملے عمرِ مری شامِ بلا کی یہ زلفِ رسا تا بہ کمر کس کے لئے ہے؟
اے شوخ کبھی جوش سے اس نظم کی ضد پر
یہ پوچھ کہ تو خاک بسر کس کے لئے ہے؟

اور گاتے وقت اس کا وائلن اپنے دلگداز نغمے کی وجہ سے اس ستار کی مانند معلوم ہو رہا تھا جسے طامس مور (صاحبِ لالہ رخ) کے قول کے مطابق شب ماہ میں، عرب کی حسین و جمیل دوشیزائیں الحمرا کے چمن زاروں میں بصد ذوق و شوق سنا کرتی تھیں۔

پرویز کی پُر اثر آواز اور تاروں کی ضربات مدھم ہوتے ہوتے چاندنی میں بالکل تحلیل ہوگئی تو اُس نے پُر معنی نظروں سے نغمانہ کو دیکھا۔ وہ اپنے خیالات میں غرق تھی اور پرویز کی موسیقی ابھی تک اُس کے کانوں میں گونج رہی تھی۔ لیکن جب اُس نے پرویز کو آنکھوں ہی آنکھوں میں مُصر دیکھا تو وہ راضی ہوگئی۔ پہلے اُس نے دھیمی آواز میں گنگنا کر اُسے لے بتائی اور جب پرویز چند ضربات کے بعد، خانہ بدوش ناچ کی گت صفائی سے بجانے لگا تو نغمانہ ایکدم یوں کھڑی ہوگئی جیسے آسمان پر سے کوئی تارا ابھی ٹوٹا ہے اور ایک خوابناک فرش پا کر مائل بہ رقص ہے۔ پھر ہولے ہولے اُس نے باکمال رقاصہ کی طرح ناچنا شروع کیا اور نغمہ و نور کے اس پُر کیف ماحول میں وہ ایک اٹھلاتے ہوئے پھول اور اُڑتی ہوئی تیز می کی مانند فضا میں لہریں پیدا کرنے لگی۔ وائلن کی چڑھتی اُترتی گت پر وہ کبھی بید مجنوں کی طرح لچکتی کبھی مُرغ آب کی طرح اُبھرتی اور کبھی دھوپ چھاؤں کی طرح پھسل سی جاتی تھی۔

وہ بہت دیر تک ناچتی گئی اور پرویز اس کے سحر آگیں رقص میں محو، وائلن بجاتا رہا۔ آخر کار وہ تھک گئی اور مسکراتی ہوئی اس کے پاس آ بیٹھی۔ اس کی جبین پر پسینے کے ننھے ننھے قطرے نمودار ہو گئے تھے اور وہ ان کے سبب شبنم میں نہائے ہوئے گل کی مانند معلوم ہوتی تھی۔ پرویز نے اپنا ساز ایک طرف رکھ دیا اور درخت کی سطح سے نیچے اتر کر بیٹھ گیا۔ نغمانہ اُسے بے حجاب نظروں سے دیکھتی رہی، جیسے اب اُسے اُس سے کوئی غیریت نہیں ہے، کوئی اجنبیت نہیں ہے۔ پرویز نے نگاہ اوپر اٹھائی اور اس کی ہنستی ہوئی، خوبصورت، سبز آنکھوں کو دیکھا، جن میں ایک کنواری حسینہ کی معصوم آرزوئیں تھیں۔ رعنا کی گمشدہ جھلکیاں تھیں۔ پرویز نے اپنا چہرہ اس کے زانو پر رکھ دیا اور شکستہ سانسوں میں وہ مبہم الفاظ کہے جو بے زبانی، سچے پرستار سے کہلواتی ہے۔ نغمانہ نے اپنے دونوں ہاتھوں میں اس کے رخساروں کو تھام کر اوپر اٹھایا اور اس کی آنکھوں میں وہ چمک پیدا ہو گئی جو صدق دل سے محبت کا اعتراف کرتی ہے، وفا کا پیمان باندھتی ہے اور جو شعلۂ دائم کی طرح زندگی بھر قائم رہتی ہے۔ پرویز کو ممنون دیکھکر اس نے اُس کا سر اپنی آغوش میں لے لیا، جیسے کوئی ہنس رانی اپنے مدتوں سے بچھڑے ہوئے، زخمی محبوب کو سمیٹ کر اپنے پروں میں لے لے اور زبانِ بے زبانی سے کہتی رہے: "تم فکر نہ کرو۔ تمہارے جو زخم لگا ہے، وہ میری گرم آغوش میں جلد مندمل ہو جائے گا اور جب تک میں جیتی ہوں تمہیں اسکی زیادہ تکلیف نہ ہونے دونگی"۔

نغمانہ زیرِ لب کہنے لگی: "میں شروع ہی سے تم سے متاثر ہوں۔ میں ابتدائی ملاقاتوں ہی میں سمجھ گئی تھی کہ تم بڑے اچھے آدمی ہو۔ تمہاری پرخلوص باتوں اور ہمدردی سے میں نے ہمیشہ یہی جانا کہ گویا ہم تم پرانے واقف کار ہیں۔ جیسے تم مجھے نغمۂ حیات سنانے آئے ہو۔ اور حقیقت یہ ہے کہ تمہاری بدولت میں نے زندگی کی وہ سحر خوشیا

حاصل کی ہے جس کا میں تصور بھی نہیں کر سکتی تھی۔"

پرویز نے اس کے دستِ گلابی پر اپنے لب رکھ دیے اور نیچی نظر کیے ہوئے بولا "یہ میری بڑی خوش قسمتی ہے۔ لیکن اتنا مجھے بھی کہنے دو کہ تمہیں دیکھکر میں نے زندگی کا خواب دوبارہ دیکھا ہے۔ تم سے مل کر مجھے کھوئی ہوئی مسرت از سرِ نو نصیب ہوئی ہے...... مگر اس کا انجام؟ انجام کیا ہوگا نغمانہ؟" یہ کہکر اُس نے نغمانہ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں۔

وہ اُسے کوئی جواب دینا چاہتی تھی کہ دفعتاً جنوب سے ہوا چلنے لگی اور اسکے ساتھ ساتھ بہت دُور سے وائلن کے بجانے کی پُرسوز صدا سنائی دی۔

نغمانہ کے پُر اشتیاق بُشرے کا رنگ بدل گیا اور وہ جلدی سے کھڑی ہوگئی۔

"دل میرا آگیا۔ یہ وہی وائلن بجا رہا ہے ــــ میں پھر آؤں گی" اور اسکی گھبراہٹ دیکھکر پرویز جیسے سینہ سپر ہوگیا "تم نہ ڈرو۔ میں تمہارے ساتھ چلتا ہوں۔ وہ تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔"

"نہیں، نہیں" نغمانہ اُسے سمجھاتے ہوئے کہنے لگی "تم میرے ساتھ نہ چلو۔ وہ بڑا ظالم ہے۔ تمہیں دیکھ کر وہ آپے سے باہر ہو جائے گا"

"لیکن میں تم پر اب اُس کا ظلم برداشت نہیں کر سکتا۔ تم مجھے اپنے ساتھ چلنے دو ــــ"

"نہیں۔ پرویز! نہیں" وہ التجا کرتے ہوئے بولی "تم ضد نہ کرو۔ میں خود تمہارے پاس جلد سے جلد آؤں گی"

ــــ اور جب وہ خوفزدہ ہرنی کی طرح طرارے بھرتی ہوئی خمدار رہگذار میں نظروں سے اوجھل ہوگئی تو پرویز کا دل دھک دھک کرنے لگا "اب کیا ہوگا؟ اب کیا ہوگا؟"

نغمانہ کو دیکھکر دلمیر نے وائلن بجانا بند کر دیا اور نرمی سے بولا "تم مجھ سے خفا ہو؟ شاید ایکے تم مجھ سے زیادہ ناراض ہو گئیں! لیکن اسقدر خفگی سے فائدہ؟"

وہ سمجھتی تھی کہ دلمیر مغلوب الغضب ہوگا اور اُسے دیکھکر بے قابو ہو جائے گا۔ غالباً اُسے گھر میں نہ پاکر وہ جھنجلا گیا ہوگا اور اُس پر اپنا غصہ اُتاریگا۔ لیکن اُسے یوں صلاحیت سے باتیں کرتے ہوئے دیکھکر اُسے بڑی حیرت ہوئی۔

دلمیر پھر بولا "میں نے تمہیں ہر جگہ تلاش کیا لیکن تم نہیں ملیں تو میں سمجھ گیا کہ اپنی خفگی کا اظہار کرنے کیلئے تم کہیں جا چھپی ہو۔ چنانچہ میں وائلن بجانے لگا کہ اُسے سنکر تم جہاں بھی ہوگی فوراً چلی آؤ گی۔"

نغمانہ اُس کے کہنے سے اُس کے پاس بیٹھ گئی اور دلمیر عاجزانہ لہجے میں کہنے لگا "میں نے تم پر پچھلے دنوں بڑی سختیاں کی ہیں۔ مجھے اس کا بڑا افسوس ہے۔ مجھے معاف کر دو۔ میں تم سے وعدہ کرتا ہوں کہ آئندہ تم سے کبھی بُری طرح پیش نہیں آؤں گا۔"

وہ اُسے اس طرح بدلا ہوا دیکھکر حیران رہ گئی۔ اس کے تلخابۂ حیات میں یہ شیرینی کیسی؟ اور اس کی اس قدر عاجزی سے، اسکے توہین آمیز سلوک کا خیال آتے ہی اُسے رونا سا آگیا۔ وہ زبان سے کچھ نہیں بولی، مگر اس کی نظروں سے ظاہر ہوتا تھا کہ اُس نے دلمیر کی بدسلوکی کا نہایت گہرا اثر لیا ہے۔ اور جب اُس نے اسکی ٹھوڑی آہستہ سے اُوپر اُٹھائی تو دیکھا کہ نغمانہ کی آنکھیں پُرنم ہو گئی ہیں۔ دلمیر نے پھر اُسی لجاجت سے کہا "اچھی نغمانہ! اگلی گذری باتوں کو بھول جاؤ۔ میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ مجھے اپنے طرزِ عمل پر ندامت ہے ـــــ بتاؤ تم نے مجھے معاف کر دیا؟"

اسکی اس قدر منت سماجت سے اُس نیکدل نے اُسے معاف کر دیا تو دلمیر

شمع رُو کے حُسن وجمال اور اُس کے لباس کی پھبن کو مسرّت بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے بولا: "خوب، خوب! اس لباس میں تو تم غضب کی حسین معلوم ہوتی ہو"۔ پھر وہ رازداری کے لہجے میں بولا: "نغمانہ! ایک خوشخبری سناتا ہوں۔ تمہیں میری جان کی قسم، ذرا مسکرا کر سُنو۔ حبشستان کے بہترین جوہری کو میں نے سات سچے سُرخ موتی دئے ہیں کہ وہ اس ہفتے کے اندر اندر تمہارے لئے ایک خوبصورت کنٹھی تیار کر دے...... میں اب زیادہ عرصے تک تم سے علیحدہ نہیں رہ سکتا۔ بس اگلے ہفتے ہم دونوں شادی کرلیں گے، اور اُس کنٹھی کو جب تم دُلہن بن کر پہنو گی تو تمہارے بے مثل حُسن میں اور بھی اضافہ ہو جائے گا......"

نغمانہ کے پیروں تلے کی زمین نکل گئی۔ اُسے ایسا معلوم ہوا کہ کسی نے اُسے آسمان اور زمین کے درمیان معلق کر دیا ہے۔ شادی کی کنٹھی اُس کے تصوّر میں آویزاں ہو گئی اور اُس کے سُرخ موتی سات خوفناک اژدہوں کی سُرخ سُرخ خونی آنکھوں کی طرح اس کی نظروں کے سامنے خلا میں چمکنے لگے "کیا کہا تم نے؟ ــــ شادی؟" نغمانہ کے مُنہ سے بے ساختہ نکلا اور دلمیر یہ سمجھتا ہوا کہ اُس نے بیاہ کا ناقابلِ یقین مژدہ سُنا کر اُسے فرطِ حیرت میں مبتلا کر دیا ہے، اندر سونے چلا گیا۔

دلمیر دن بھر کام کاج میں مصروف رہا۔ لوگ اُس کے پاس برابر آتے جاتے رہے اور وہ اُن سے پھلوں کی کاشت اور اُن کے کاروبار کے متعلق بات چیت کرتا رہا۔ اس دوران میں اس کا مزاج خلافِ معمول بہت کم بگڑا اور وہ مقدور بھر، سب سے تحمّل کے ساتھ گفتگو کرتا رہا۔ البتہ جب اُس نے کئی بار نغمانہ کو بُلایا اور وہ نہیں آئی تو اُس نے بے حد بُرا مانا۔ لیکن یہ سوچ کر ہر دفعہ ضبط سے کام لیتا رہا کہ وہ

شادی کے خیال سے محجوب ہو گئی ہے اور اسی لئے اُس کے سامنے نہیں آنا چاہتی۔ مگر اس قدر خاموشی اور اُس سے اتنا احتراز کیوں؟ کیوں وہ کمرے میں بند ہے؟ کیوں وہ یہ ظاہر نہیں کرتی کہ میں بے انتہا خوش ہوں؟"

شام ہوتے یکایک دلمیر کا دماغی توازن جاتا رہا، اور اُس نے غضبناک آواز میں کہا "مجھے نہیں معلوم تھا کہ وہ بدمعاش ابھی تک یہیں ہے۔ اور وہ نمک حرام نغمانہ ......؟"

نغمانہ کے کان کھڑے ہو گئے اور وہ، جو کئی بار اُس کی محبت بھری پکار سُنکر بھی اُسے دیکھنے کی روادار نہیں ہوئی، فوراً برآمدے والی کھڑکی کے پاس آ گئی۔ وہیں سے اُس نے جھانک کر دیکھا کہ دلمیر کے سامنے دو ماہی گیر کھڑے ہوتے ہیں۔ جنہیں اُس نے کل صبح پرویز کے ساتھ ساحلِ سمندر پر جاتے ہوتے، اپنی طرف متوجہ دیکھا تھا۔ اس پر سناٹا چھا گیا اور جیسے اُسے بجلی کے کرنٹ نے جھٹکا دیا ہو، وہ پیچھے ہٹ گئی۔

دلمیر کا اشتعال بڑھتا جاتا تھا "...... کارخانس! تم ابھی اس ملعون کے پاس جاؤ اور اُس سے کہو کہ اگر وہ اپنی خیریت چاہتا ہے تو اسی وقت یہاں سے چلا جائے۔ ورنہ میں اُسے زندہ نہیں چھوڑوں گا۔ میں اپنے ناخنوں سے اس کا منہ نوچ لونگا۔ اس کی آنکھیں پھوڑ ڈالوں گا تاکہ اس کا وہ لال لال چہرہ، جس کی خوبصورتی میرا گھر اجاڑ رہی ہے، بدوضع اور بھیانک ہو جائے۔ میں سچ کہتا ہوں کہ اگر وہ اب ایک منٹ بھی یہاں رہا تو اُسے جان سے مار ڈالوں گا ...... آخر اُسے یہاں آنے کی ضرورت کیا تھی؟ کیا وہ یہاں اس لئے آیا ہے کہ نغمانہ کو مجھ سے جدا کر لے ...؟"

اسکی آواز گلوگیر ہو گئی "کارخانس! میری طرف دیکھو! کیا میں بہت بُرا ہوں؟ کیا مجھے دیکھکر گھن آتی ہے؟ کیا میں نے کسی کا کچھ بگاڑا ہے؟ پھر وہ مجھ سے اُچھنے کیوں

آیا ہے؟ اس نے کیوں مجھے تباہ کرنے کی ٹھانی ہے؟ کارخانس! جاؤ، جلدی جاؤ اور
جس طرح بھی ہو سکے اُسے یہاں بھیج دو۔"

کارخانس اور دوسرے ماہی گیر کے جانے کے بعد دلمیر وہاں اکیلا رہ گیا۔ وہ
بہت دیر تک برآمدے کے باہر صحن میں آکر ٹہلتا رہا اور کوشش کرتا رہا کہ اس کا
غصّہ فرو ہو جائے تاکہ وہ جاکر نغمانہ سے اس بارے میں گفتگو کرے۔ آخر وہ مضطربانہ
نغمانہ کے کمرے تک آگیا اور دروازے پر دستک دیکر اس کو بار بار پکارا۔ وہ اندر
بُت بنی ہوئی بیٹھی تھی۔ دلمیر کی آوازوں سے اور بھی پریشان ہو گئی۔

دلمیر نے وہیں کھڑے کھڑے کہا" مجھے سب کچھ معلوم ہو چکا ہے۔ تم اس شخص
کے ساتھ، جسے میں نے اس دن تمہیں دودھ پیش کرتے ہوئے دیکھا تھا، میری
عدم موجودگی میں دن رات مزے اڑاتی پھری ہو ـــــ میں نہیں جانتا تھا کہ
وہ آوارہ غیر ملکی ہماری وادی کی بھولی اور کنواری لڑکیوں کو اپنے دام فریب میں
گرفتار کرنے آیا ہے۔ میں تو یہی سمجھتا تھا کہ وہ تجارت کرنے آیا ہے اور میرے انکار
پر واپس چلا گیا ہوگا۔ لیکن میں نے آج اس کے سب کرتوت سُنے، اور اس کی
جسارت کی ذمہ دار تم ہی ہو ـــــ مگر میں اب بھی تمہیں معاف کرسکتا ہوں بشرطیکہ
تم اپنے جرموں کا اقرار کر لو۔"

اندر سے کوئی جواب نہیں آیا تو وہ پیچ و تاب کھانے لگا" بولتی کیوں نہیں؟
کیا تمہیں سانپ سونگھ گیا ہے؟" اور جب وہ اس پر بھی نہیں بولی تو اُسے ضبط کا
یارا نہیں رہا۔ پھر بھی اُس نے ایک اور آخری کوشش کی لیکن اس کی آواز میں جھنجلاہٹ
اور طیش پیدا ہو چکا تھا" میں تم سے آخری بار سوال کرتا ہوں۔ اگر تم نے اس کا
بھی جواب نہ دیا تو مجھ سے بُرا کوئی نہیں ہوگا، بتاؤ تم مجھ سے شادی کرو گی؟"

اور نغمانہ نے ہمت کر کے جواب دیا" نہیں ـــ"

جیسے کسی نے اُسکے سر پر ہتھوڑا مارا ہو، دلمیر آپے سے بے آپے ہوگیا۔" ہوں!! اچھا، میں تجھے سمجھونگا۔ کمینی ہے نا آخر۔۔۔؟" اور یکایک کار خانس کے بیرونی دروازہ کھولنے سے اسکی توجہ اُس طرف مبذول ہوگئی۔

وہ جلدی سے باہر آگیا۔ کار خانس نے اُسے بتایا کہ وہ اجنبی کہیں گیا ہوا ہے اور خیمے میں صرف اُس کا ملّاح اکیلا بیٹھا ہے۔ کچھ سوچ کر دلمیر اپنی بھاری اور بلند آواز میں بولا۔" تم یہیں دروازے پر بیٹھے رہو اور جب تک میں نہ آؤں یہاں سے نہ ہلنا۔ نغمانہ یہاں سے کہیں جانے نہ پائے۔ میں تھوڑی دیر میں واپس آتا ہوں"!

اس کے دروازے سے نکلتے ہی نغمانہ نے ڈر کر اپنے دل پر ہاتھ رکھ لیا۔ اگرچہ اُسے یقین تھا کہ دلمیر بزدل ہے اور وہ پرویز پر حملہ کرنے کی جرأت نہیں کر سکتا مگر اُس کی رقابت اور حاسدانہ خصلت سے اُسے اندیشہ ہوگیا کہ کہیں کسی اور ترکیب سے وہ۔۔۔۔! اور پرویز کا خوبصورت چہرہ زخمی اور بھیانک ہو کر اُس کے تصوّر میں آگیا۔ وہ کانپ اٹھی اور بھاگ کر پیچھے کے دروازے سے نکل آئی۔ اور۔۔۔۔ پائیں باغ میں اُس نے دیکھا کہ اس کا محبوب، پچھلی دیوار پر چڑھ رہا ہے۔

اُس کا سانس جیسے ایک سیکنڈ کے لئے رُک گیا۔ پھر جب اس میں آمد و رفت شروع ہوئی تو جوار بھاٹے کی طرح اُسکے سفید پوش سینے میں بڑی تیزی سے زیر و بم ہونے لگا اور دبی آواز میں اسکے مُنہ سے بے اختیار نکلا۔" پرویز!"

پرویز خاموشی سے کود کر اندر آگیا اور جب وہ دونوں چاند کی روشنی سے بچنے کیلئے ایک اونچے بار آور درخت کی آڑ میں آگئے تو اس نے سرگوشی کے لہجے میں کہا: " خدا بہتر جانتا ہے میں نے کل کی رات اور آج کا دن کس حال میں گذارا! میں اگرچہ وہاں تھا مگر میرا دل یہیں پڑا رہا اور اس وقت مجھ سے نہ رہا گیا تو میں تمہیں دیکھنے

چلا آیا ـــ بتاؤ تم پر کیا گذری ؟"

نغمانہ پر بے چارگی چھا گئی اور اُس نے آہستہ آہستہ کہا" پرویز ! میری ایک درخواست ہے۔ نہیں، التجا ہے۔ میں تم سے بہ منت کہتی ہوں کہ جس قدر جلد ہو سکے تم یہاں سے چلے جاؤ" اور اُس نے یہ درخواست جس قدر رُک رُک کر کی تھی اُس سے اس کا دلی رنج ظاہر ہوتا تھا۔

پرویز خاموشی سے سنتا رہا اور جب وہ ختم کر چکی تو اُس نے پوچھا" لیکن کیوں؟ کیا میرے چلے جانے سے تمہیں مسرت ہوگی؟"

نغمانہ ساکت وجامد اُسے دیکھتی رہی اور جیسے کوئی مستحکم لہجے میں کہے، اُسنے جواب دیا" ہاں"

"نہیں۔ مجھے یقین نہیں آتا" پرویز اُس کی سہر آنکھوں میں حقیقت کو پہچانتا ہوا بولا" تم یہ "ہاں" دل سے نہیں کہہ رہی۔ بلکہ تم مجھ سے کوئی بات چھپا رہی ہو۔ دلمیر نے ضرور تمہارے ساتھ زبان درازی کی ہوگی اور اسی کا تم پر اثر ہے۔ غالباً اسکو سب کچھ معلوم ہو گیا ہے اور اسکی دھمکیوں سے تم ڈر گئی ہو"

"پرویز ! میں تمہارے آگے ہاتھ جوڑتی ہوں۔ میرا کہا مانو، اور میری خاطر اس وادی سے فوراً چلے جاؤ" اور اسکی جُدائی کے خیال سے نغمانہ کی آنکھوں میں آنسو جھلک آئے" تمہاری جان یہاں خطرے میں ہے۔ تم دلمیر کو نہیں جانتے وہ اپنی غرض کیلئے بُری سے بُری حرکت کر گذریگا"

"تم میری فکر نہ کرو" اُس نے اُس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیکر دوسرے ہاتھ سے اس طرح تھپکا جیسے وہ اُسے یقین دلا رہا ہے کہ میں تمہاری حفاظت کرونگا۔ میں تمہیں بتا دونگا" میں یہ چاہتا ہوں کہ تمہیں کسی طرح اس ظالم اور اُجڈ کے چنگل سے نکال لوں۔ تم مجھ پر اعتماد کرو اور میرے ساتھ ـــــ"

"پرویز!" اُس نے آہستگی سے کہا "پرویز! وقت گذرا جا رہا ہے. خدا کے واسطے تم چلے جاؤ اور مجھے میرے حال پر چھوڑ دو. دُنیا میں عورت تو ہمیشہ محروم و محزوں ہی رہتی ہے. لیکن میری خاطر تم اپنی جان بچاؤ. میں اب تم سے اور کچھ نہیں سنونگی. وعدہ کرو کہ ابھی ابھی یہاں سے روانہ ہو جاؤ گے. ہاں، میں تم سے اتنا عہد کرتی ہوں کہ جب تک میری زندگی باقی ہے، میں ہمیشہ تمہیں یاد رکھونگی. بس پرویز! بس، اب اور کچھ نہ کہو. وقت نہیں ہے. اس دروازے پر پہرہ لگا ہوا ہے اور ڈلمیر شاید تمہاری ہی تلاش میں گیا ہے ــــــ وہ دیکھو، اس کی آواز آئی. اب میں رخصت ہوتی ہوں. الوداع! پرویز الوداع!! اللہ تمہیں صحیح سلامت واپس لے جائے" اور وہ اپنے آنسوؤں کو چھپاتی ہوئی مُڑ گئی. جاتے جاتے پرویز نے اس کے سپید لباس کو جوشِ محبت میں بوسہ دیا اور جب وہ بہ حسرت دیاس اور بہ چشمِ گریاں وہاں سے چلی گئی تو خاموشی سے اُس نے دیوار پھلانگی اور اپنے دل میں ہزاروں ویرانیاں لئے ہوئے وہاں سے چلا آیا.

اُس کے دماغ میں کشمکش جاری تھی اور مختلف قسم کے خیالات گردش کر رہے تھے. آخر خیمے تک پہونچ کر اُس نے فیصلہ کر لیا کہ میں ہرگز یہاں سے نہیں جاؤنگا. اور نغمانہ کو اس عذاب سے بچانے کیلئے ہر ممکن کوشش بروئے کار لاؤنگا.

ڈلمیر جھپک کر اپنے خاص کمرے میں چلا گیا جہاں اس کا روپیہ اور قیمتی اشیاء محفوظ رہتی تھیں. تھوڑی دیر میں وہ وہاں سے نکل آیا اور باہر آکر صدر دروازے کے پاس مضطربانہ ٹہلنے لگا. گھڑی گھڑی وہ پھاٹک سے اُچک کر اِدھر اُدھر دیکھ لیتا تھا، جیسے وہ کسی کا سخت بے چینی سے انتظار کر رہا ہے. جب رات کافی جا چکی تو اُس نے اپنے مکان کو آنے والی رہگذار پر کسی کے محتاط قدموں کی چاپ سُنی

اور نہایت سرعت سے وہ پھاٹک کے باہر چلا گیا۔ کچھ وقت گزرنے کے بعد وہ واپس آیا۔ چاندنی رات میں اس کے چہرے سے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اُس نے کوئی بہت بڑی فتح پائی ہے۔ کسی کارِ عظیم میں اُسے کامیابی نصیب ہوئی ہے اور وہ ہشاش بشاش اندر داخل ہوا۔

نغمانہ برآمدے والی کھڑکی سے لگی ہوئی اس کی تمام حرکات و سکنات دیکھ رہی تھی۔ اُسے یوں خوش خوش گھر میں گھستے دیکھ کر وہ سمجھ گئی کہ اُس نے کوئی گل کھیلا ہے۔ اس کے دروازے کے سامنے سے گذرتے ہوئے دلمیر نے طنزیہ قہقہہ لگایا اور یہ کہتا ہوا آگے بڑھ گیا۔ "اری سو رہی ہے؟ ــــ تیرا عاشق تو تجھے چھوڑ کر چلا گیا۔ اب دیکھ تجھے کیسا سیدھا کرتا ہوں!"

پرویز کے جانے کی خبر سُنکر نغمانہ کو بہ یک وقت صدمہ بھی ہوا اور خوشی بھی۔ اچھا ہی ہوا کہ وہ یہاں سے چلا گیا ورنہ یہ وحشی اُسے گزند پہونچائے بغیر نہ رہتا لیکن پھر اس خیال کے آتے ہی کہ وہ اُس سے ہمیشہ کے لئے جُدا ہو گئی ہے، اُس پر رنگِ الم طاری ہو گیا ہے۔

رات اپنے سفر کی تین منزلیں طے کر چکی تو نغمانہ اپنے کمرے سے دبے پاؤں نکلی۔ اُس نے دلمیر کی خوابگاہ کے دروازے سے کان لگا دیے۔ اندر سے خراٹوں کی آوازیں آرہی تھیں اور وہ بے خبر و مطمئن سو رہا تھا۔ نغمانہ چوروں کی طرح باہر نکل آئی اور رہگذار پر گامزن ہو گئی۔ دن بھر کے کسل اور دو راتوں کی بیخوابی کا اثر اسکے تمام جسم پر تھا۔ مگر دل کی لگی بُری ہوتی ہے۔ وہ برہنہ پا بھاگی ہوئی چلی جا رہی تھی اور کوئی اس کے کانوں میں لگاتار کہہ رہا تھا۔ "ہاں، اور تیز! اور تیز!!"

بالآخر وہ منزلِ مقصود پر پہونچ گئی ــــ خیمہ اُٹھ چکا تھا۔ کشتی جا چکی تھی اور اب صرف گذری ہوئی دلچسپیوں اور مٹی ہوئی خلوتوں کی یادگار وہاں کی وہ غیر مرئی

نظارہ گئی تھی جس میں اُن دونوں نے بارہا محبت کے سُہانے خواب دیکھے تھے۔ وہ وہیں صنوبر کے درخت سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئی اور سمندر کی موجوں کو چُپ چاپ دیکھنے لگی جو اُس کے محبوب کی کشتی کو دُور، بہت دور، نہ جانے کہاں پہونچا کر لوٹی ہوں گی۔ اور اس عالمِ تنہائی میں، اُس کے دل و دماغ میں فراقِ محبوب کا احساس اپنی پوری شدّت کے ساتھ اُجاگر ہو گیا۔ اور اُس کی آنکھوں سے ـــــ اُن آنکھوں سے جن کا والہ و شیدا اب اُسے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے بے یار و مددگار چھوڑ کر چلا گیا تھا ـــــ ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے۔ اس کے دل میں دفعتاً ایک ہوک سی اُٹھی "کاش! وہ مجھے اپنے ہمراہ لے جاتا! کاش! میں اُس کے ساتھ چلی جاتی۔ میں کیا جانتی تھی کہ وہ میری رگ رگ میں سما گیا ہے اور میں اُس کے بغیر ایک لمحہ بھی یہاں نہیں رہ سکتی" ـــــ ایک چھوٹی سی لہر تنگنائے میں سے ہوتی ہوئی ساحل سے آٹکرائی اور نغمانہ کو ایسا محسوس ہوا کہ وہ کہہ رہی ہے "اری دیوانی! اب کیا پچھتاتی ہے؟ تو نے ایک بھٹکے ہوئے پکھیرو کو نشیمن کی اُمید دلا کر پھر نا اُمید کر دیا۔ یہ بُرا کیا" اور اُس کے دل نے بے اختیار چاہا کہ اس سطحِ سمندر کا سینہ چیر کر، جس پر سے پرویز مایوس و ملول، بار بار ادھر دیکھتا ہوا گذرا ہوگا، ایک پُر سوز شرارہ نکلے اور صورتِ آتش اُسے جلا کر خاکستر کر دے۔ اُسے اپنی کم ہمّتی اور اس بات پر بےحد غصّہ آیا کہ دلگمیر کے خوف سے اُس نے پرویز کی بات پوری نہ ہونے دی، اور اس کی عقل نے کہا، اب اُس پشیمانی سے کیا فائدہ؟ تم ہی نے تو مصر ہو کر اُسے یہاں سے بھیجا ہے۔ پھر اُسکے چلے جانے سے کیوں رنجیدہ ہو؟

آسمان پر تارے ماند ہو چلے تھے اور چاندنی بے نور ہونے لگی تھی۔ اُس نے ایک ٹھنڈا سانس لیا جیسے آہ بھر کر اپنے غم و اندوہ کو ہلکا کرنا چاہتی ہو۔ پھر وہ خالی الذہن ہو کر کھڑی ہو گئی۔ وہ نہیں جانتی تھی کہ میں اب کیا کروں؟ کہاں جاؤں؟

اور جب وہ ایک شکست خوردہ کھلاڑی کی طرح مضمحل اور افسردہ رہگذار پر آئی تو خانقاہ کی سمت سے ہوا کا جھونکا آیا اور اس کے ساتھ ساتھ ـــــ اُس نے کہیں دُور پرویز کے کراہنے اور اپنا نام پکارنے کی آوازیں سُنیں۔

ـــــ جیسے کوئی یکایک خواب سے چونک اُٹھے، لغمانہ بیتاب ہوگئی اور انتہائی پُھرتی سے خانقاہ کی جانب روانہ ہوئی۔ وہاں پہونچکر اُس نے ڈھلان کی طرف جھانکا تو یہ دیکھکر دم بخود رہ گئی کہ پہاڑی کے دامن میں پرویز بےحس و حرکت پڑا ہوا ہے۔

ـــــ اور میلوں پرے، پرویز کا ملّاح خوش و خرّم اپنی کشتی جلدی جلدی چلا رہا تھا۔ گاہے گاہے اُس کی نظر اُس مال و متاع پر پڑ جاتی تھی جسے وہ مالِ غنیمت کی طرح وادیٔ نشیمن سے لُوٹ کر لایا تھا۔ اس کے سامنے موٹے موٹے رسّوں کے اُوپر لپٹا لپٹایا خیمہ پڑا ہوا تھا اور دوسری طرف پرویز کا باقی سازوسامان، جس میں روپوں سے بھرا ہوا اٹیچی کیس بھی شامل تھا۔ اُسے دیکھکر اُس نے اپنی انٹی پر ہاتھ پھیرا، جس میں دلمیر کے دئے ہوئے پچاس روپے بندھے ہوئے تھے۔ انہیں محسوس کر کے وہ ہنسنے لگا۔ دل ہی دل میں خوش ہونے لگا۔ اُس کی ہنسی بلند آواز قہقہے میں تبدیل ہونے لگی، اور اس کے ساتھ ساتھ وہ تمام واقعات، تصویروں کی مانند اُسکی آنکھوں میں پھر گئے جن کے نتیجے کے طور پر وہ اس کشتی میں سوار، ایک دولت مند قزاق کی طرح، راتوں رات اُس وادی سے یہاں تک میلوں مسافت طے کر کے آیا تھا............

...... کارخانس نے جب آکر بتایا کہ وہ اجنبی کہیں گیا ہوا ہے اور خیمے میں صرف اس کا ملّاح اکیلا بیٹھا ہوا ہے تو معاً دلمیر کے سازشی دماغ نے ایک ترکیب سوچی، اور وہ کارخانس کو وہیں گھر پر پہریدار بنا کر خیمے کی طرف دوڑا چلا آیا۔ موقع

پاکر اُس نے ملّاح کو اشارے سے بُلایا اور تنہائی میں لے جاکر اُس نے اُس سے پرویز کی موت کا سودا کیا۔ ملّاح پچاس روپے نقد اور اس شرط پر کہ پرویز کے کُل ساز و سامان کا مالک میں ہونگا، دلمیر کی تجویز پر راضی ہوگیا۔ چنانچہ جب پرویز کو خیمے میں واپس آئے ہوئے کوئی گھنٹہ بھر ہوگیا ہوگا تو ملّاح اُس کے پاس بھاگا ہوا آیا اور ہانپتا ہوا بولا "سیٹھ! میرے ساتھ جلدی چلو۔ خانقاہ والی ڈھلان پر وہ لڑکی آپ کو بلا رہی ہے ــــ"

پرویز گھبرا کر اُٹھ بیٹھا اور فوراً اُس کے ساتھ ہولیا۔ خانقاہ کی ٹوٹی ہوئی فصیل کے پاس پہونچکر اُس نے کہا "وہ دیکھو، سیٹھ۔ وہ! جہاں ایک چھوٹی سی کشتی بندھی ہوئی ہے، وہیں وہ لڑکی آپ کا انتظار کر رہی ہے۔ ذرا آگے بڑھکر دیکھو"

پرویز نے بے صبری سے آگے بڑھکر جھانکا تو ملّاح نے پیچھے آکر پوری طاقت سے اُسے دھکا دیدیا۔ وہ ایک خوفناک چیخ کے ساتھ نیچے جاپڑا۔ چند لمحات بعد چاروں طرف بھیانک خاموشی چھاگئی۔ جسے کبھی کبھی سمندر کی لہریں اپنی مخصوص صداؤں سے توڑ دیتی تھیں۔ ملّاح پھر نہایت سرعت سے دلمیر کے پاس آیا اور اُس نے اُسے اپنی کارگذاری نہایت مبالغے کے ساتھ سُنائی کہ میں نے اُسے سمندر میں ڈبو دیا ہے۔ دلمیر نے اطمینان کا سانس لیا اور اُسے طے شدہ رقم دیکر سختی سے ہدایت کی کہ فوراً خیمہ اُٹھا کر یہاں سے چلے جاؤ۔ نیز انہوں نے آپس میں وعدہ کر لیا کہ وہ ہمیشہ اخفاءِ راز کرینگے۔ گویا وہ پرویز کے متعلق کچھ نہیں جانتے۔

.... اور اب وہ مالدار ملّاح اپنے تصوّرات میں مگن کشتی کو تیز تیز چلا رہا تھا۔

نغمانہ ہانپتی کانپتی ڈھلان پر سے بھاگتی آئی۔ بغیر دیکھے بھالے اور تیزی سے بھاگنے کے سبب اُسکے پاؤں سے خون نکل رہا تھا، مگر وہ بے جگری سے بھاگتی رہی اور اسنے

نیچے ساحل پر آکر ہی دم لیا ـــــ پرویز پتھروں کی رگڑ سے زخمی اور نڈھال ہو گیا تھا۔ اُس کے چہرے اور بدن پر چوٹوں کے نشان پڑے ہوئے تھے اور بلندی سے گرنے کی وجہ سے وہ نیم بے ہوش تھا۔ اُس کی یہ حالت دیکھ کر نغمانہ سکتے میں رہ گئی اور اُسے ایسا محسوس ہوا کہ کسی نے اُس کے دل پر زور سے گھونسہ مارا ہے جس کی وہ تاب نہیں لاسکتی۔ تھوڑی دیر بعد اُس کے خیالات جب آہستہ آہستہ مجتمع ہوگئے تو دوزانو ہو کر اُس نے جلدی سے پرویز کا لہولہان سر اپنی گود میں رکھ لیا اور اُسکی آنکھیں آپ ہی آپ ڈبڈبا آئیں۔

پرویز درد و کرب سے پھر کراہنے لگا۔ چوٹوں کی تکلیف نے اُس کی جان پر بنادی تھی۔ اُس کے منہ سے اپنا نام سُن کر نغمانہ نے سرگوشی میں کہا: "پرویز! میں تمہارے پاس ہوں!"

یکایک اس کا کراہنا بند ہو گیا جیسے اس کے زخموں پر کسی نے مرہم لگا دیا ہے اور اس جان لیوا تکلیف کو برداشت کرنے کی اس میں سہار پیدا ہو گئی ہو۔ اسکے چہرے کی سلوٹوں اور تیوری کے بلوں سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ اپنے جسمانی آلام کو انگیز کرنے کی کوشش کر رہا ہے اور نہیں چاہتا کہ اُس کے منہ سے ذرا بھی اُف نکلے۔ نغمانہ چپ چاپ اُسکے چہرے سے رِستا ہوا خُون پونچھے جا رہی تھی لیکن خُون برابر اُس کے سر، ماتھے اور نتھنوں سے نکلا چلا آرہا تھا۔

نغمانہ ڈر گئی۔ لیکن اُس نے ضبط سے کام لیا اور حوصلہ افزا لہجے میں بولی:۔

"پرویز! تم مجھے پکار رہے تھے، میں آگئی ہوں، مگر یہ تمہیں کیا ہوا؟"

پرویز کو ہوش آیا تو وہ بچوں کی طرح رونے لگا اور اُس نے گھٹی ہوئی آواز میں کہا: "مجھے ملاح تمہارے نام سے دھوکہ دیکر بُلا لایا تھا اور اُس نے مجھے اُوپر سے دھکا دیا ہے۔ اُف یہ تکلیف برداشت نہیں ہوتی ـــــ نغمانہ! میں چلا"

"ایسا نہ کہو پرویز!" وہ اس شمع پر نثار ہوتی ہوئی بولی: "تکلیف جلد رفع ہو جائے گی" اور ملّاح کی فریب دہی کا حال سُنکر اُسے دلگیر کا رات کو مضطرب و منتظر ٹہلنا اور کسی کے دبے پاؤں آتے ہی اس کا احاطے سے باہر چلا جانا۔ پھر وہاں سے ظفرمند و مسرور آنا...... اُسے یہ سب باتیں یاد آگئیں اور وہ معاملے کی تہ کو پہونچ گئی۔

پرویز نے ٹٹول کر اس کا ہاتھ تھام لیا اور بھرّائی ہوئی آواز میں بولا:
"آہ! میری آنکھیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کسی نے شیشے کی کرچیاں اُن میں بھر دی ہیں" اور یہ کہہ کر اُس نے آنکھیں کھولیں تو اُن میں سے جیتا جیتا خون بہ نکلا۔
"یہ لال لال کیا ہے؟ مجھے اس سُرخی کے علاوہ کچھ اور نظر نہیں آتا"
نغمانہ نے جلدی سے اُس کی آنکھیں پونچھ دیں اور تسلّی دیتے ہوئے کہنے لگی "کچھ نہیں ہے۔ رونے سے تمہارے آنسو نکل آئے ہیں۔ آنکھیں بند کر لو، ابھی آرام آجائے گا"

اُس نے آنکھیں بند کر لیں اور آہستہ آہستہ کہنے لگا: "نغمانہ! میں اب نہیں بچونگا۔ میرا آخری وقت آن پہونچا ہے۔ تم میری قبر ——"
نغمانہ نے بے اختیار اس کے لبوں پر اپنا رخسار رکھکر اُسے آگے کہنے سے روک دیا۔ صبح کاذب نمودار ہو گئی تھی اور کوئی دم میں اُجالا پھیلنے والا تھا۔ اُس نے چاروں طرف سہمی ہوئی نظریں دوڑائیں اور ساحل پر دلگیر کی کشتی بندھی ہوئی دیکھکر اسکے جزیرۂ تخیّل میں ایک شاہراہ بنتی چلی گئی۔
"پرویز!" اُس نے اُسے محبت سے لبریز لہجے میں آواز دی۔ "تم ذرا ہمّت کر لو۔ ایک دو قدم۔ وہ سامنے کشتی بندھی ہوئی ہے۔ اس میں ——"
"اوہ! —— میری ٹانگیں رہ گئیں ہیں نغمانہ! میں چل نہیں سکتا —— اور

یہ کشتی کیا اُسی ملاح کی ہے؟"

"نہیں —— یہ کشتی کسی اور کی ہے۔ تم اپنے دل کو مضبوط کرو تو اُجالا ہونے سے پہلے ہی ——"

"نہیں نغمانہ! میری زندگی کا چراغ گُل ہوا چاہتا ہے۔ مجھے اپنے سے جدا نہ کرو۔ میری تُربت ......"

"نہیں نہیں پرویز" وہ اپنے آنسوؤں کو ضبط کرتے ہوئے بولی "میں تمہارے ساتھ چلوں گی"

"میرے ساتھ!" پرویز نے ایسے لہجے میں کہا جیسے اُسے یہ سُنکر بے انتہا خوشی ہوئی ہے مگر اُسے اپنے کانوں پر یقین نہیں آیا۔ "کیا تم سچ مچ میرے ساتھ چلوگی؟"

"ہاں، ہاں، پرویز! تم مجھے اپنے ساتھ لے چلو۔ اُٹھو، میں تمہیں سہارا دیتی ہوں"

پرویز میں سوائے سانس کی ہلکی جنبشوں کے کوئی حرکت نہ ہوسکی اور —— سپیدۂ سحر دم بہ دم بڑھتا جا رہا تھا۔

پرویز نے شکستہ دل ہوکر کہا "مجھ میں سکت نہیں ہے۔ شاید میں اب چند لمحوں کا مہمان ہوں۔ پھر یہ جسم مُشتِ خاک ہو جائیگا"

نغمانہ نے ایکاایکی اپنا ایک ہاتھ اسکی گردن اور دوسرا اُسکی ٹانگوں میں ڈالکر پوری طاقت سے اُسے اُٹھالیا —— اور صبح طلوع ہونے لگی۔

جب وہ آہستگی سے اُسے کشتی میں لٹا چکی تو اُس نے رسّیاں کھولدیں۔ پھر اُس نے ایک پاؤں کشتی کے اندر اور دوسرا ساحل کے قدیم پتھر پر ٹکا کر، چپّو کی مدد سے پیچھے کی طرف زور لگایا۔ کشتی سرک گئی اور ہولے ہولے سطحِ آب پر رواں

ہو گئی۔ پھر اُس نے مستول پر لیٹے ہوئے بادبانوں کو کھولا اور جب اُن میں ہوا بھر گئی تو پرویز کے سرہانے بیٹھ کر اُس نے اُس کا سر اپنے زانو پر رکھ لیا۔

—— صبح ہو گئی اور نیّرِ اعظم بادلوں کی زنجیروں کو جھٹک کر اس طرح نکل آیا جیسے کوئی محکوم ملک یکلخت غلامی کی بیڑیوں کو کاٹ کر آزاد ہو جائے۔

کشتی تیزی سے بہی چلی جا رہی تھی اور نغمانہ اپنے محبوب کے زخمی مکھڑے کو بار بار صاف کر رہی تھی۔ یکایک پرویز کے جسدِ بیمار میں جنبش پیدا ہوئی اور اُس نے نہایت نحیف آواز میں کہا " نغمانہ! —— میری رعنا! میری رعنا! مجھے اپنی آغوش میں لے لو۔ مجھے اچھی طرح سنبھال لو۔ میرا دل گھبرا رہا ہے۔"

نغمانہ نے دیکھا کہ نیچے کا تختہ خون کے دھبّوں سے سُرخ ہو گیا ہے، اور اُس کا چہرہ سُست جانے کی وجہ سے بھیانک ہوتا جا رہا ہے۔ پھر یکبارگی کسی اندیشے سے وہ اُس سے لپٹ کر رونے لگی۔ " میں اکیلی ہوں، بالکل اکیلی ہوں۔ تم مجھے یوں چھوڑ کر نہ چلے جانا، پرویز! میں نے تم پر بھروسہ کیا ہے۔"

پرویز کے زرد چہرے پر سکون طلوع ہونے لگا گویا اُس نے نغمانہ کی التجا سُن لی ہے۔ سمجھ لی ہے اور وہ دردناک آواز میں رُک رُک کر، بصد مشکل بولا، " تم میرے ساتھ کہاں تک چلو گی؟ جانے مجھے کس دیس جانا ہے۔"

نغمانہ نے بغیر سمجھے، اُس کے بالوں کو آہستہ آہستہ سہلاتے ہوئے کہا، " مجھے نہیں معلوم یہ کشتی ہمیں کہاں لے جائے گی! ہماری منزل نامعلوم ہے۔ ہماری سمت غیر معیّن ہے۔ میں یہ بھی نہیں جانتی کہ ہمارا سفر کہاں ختم ہو گا۔ ہمیں خشکی کب نظر آئے گی —— شاید شام تک، شاید کل تک۔ ہم یونہی چلتے رہیں۔ آگے بڑھتے رہیں۔ اُس وادی سے دُور جہاں ایک ظالم نے نہیں ——"

یکایک کشتی کا سفید بادبان، جو اب تک محبت کا حسین وجمیل پرچم بن کر ہوا میں اُڑ رہا تھا، سرنگوں ہو گیا اور نغمانہ نے دیکھا کہ اس کا حبیب جو اُس کی آغوش میں محوِ استراحت تھا اس کی سرگوشیوں کو حسرت و یاس کے ساتھ سنتا ہوا اُس سے غافل ہوئے جا رہا ہے۔

نغمانہ کلیجہ تھام کر رہ گئی اور اُسے یوں محسوس ہوا جیسے خود اس کا دل کسی نامعلوم اندھیرے میں ڈوبا جا رہا ہے۔

(مارچ ۴۳ سنہ ۶)

(کتبہ محمد احمد ۴۳ سنہ ۶)

شمعِ انجمن

صادق الخیری کے سولہ خیال افروز افسانوں کا مجموعہ

"صادق الخیری اردو کے ترقی پسند افسانہ نگار ہیں اور اُس وقت سے ترقی پسندی کو افسانوں میں برت رہے ہیں جب اس کا چرچا آجکل کی طرح ہر گلی کوچہ میں نہ تھا۔ ان افسانوں کا موضوع افسانہ نگار کے مختلف قسم کے تجربات اور تصورات ہیں۔ مثلاً عورت اور مرد کی محبت، ان کے جنسی تعلقات کی فطرت اور نفسیات سے ہم آہنگی۔ مشرقی معاشرت اور اس کی نازک نفسیات! ان کے رومان میں ہر جگہ مشرقی پردہ داریوں کی جھلک نظر آتی ہے ان کے کھینچے ہوئے مناظر پر کسی جگہ مغرب کی چھاؤں بھی پڑتی دکھائی نہیں دیتی۔ ان افسانوں میں مشرقیت اور ادبیت سے زیادہ صداقت ہے۔"

(پروفیسر عظیم وقار ایم۔اے۔ براڈکاسٹ از آل انڈیا ریڈیو دہلی)

"صادق الخیری ملک کے ان چند افسانہ نگاروں میں سے ہیں جو زبان و بیان دونوں کو ساتھ لیکر آگے بڑھتے ہیں۔ اور اسی لئے ان کی ہر ندرت و بدعت بہت بھلی معلوم ہوتی ہے مجھے نہیں معلوم کہ صادق الخیری کا ترقی پسند مصنفین میں شمار ہوتا ہے یا نہیں، لیکن ان کے یہ افسانے دیکھ کر اس قدر ضرور کہہ سکتا ہوں کہ اگر "ترقی پسندی" اس سے زیادہ کچھ اور چاہتی تو دنیا اس کے ملنے کیلئے ابھی تیار نہیں۔ ان افسانوں کے تار و پود میں مغربی اندازِ بیان،

اور دہلی کی زبان کا بہت لطیف امتزاج پایا جاتا ہے۔ اور ہم ان کو پڑھ کر ایسا محسوس کرتے ہیں کہ یہ سب کچھ کسی اپنے ہی آدمی نے اپنوں ہی کیلئے لکھا ہے"

(علامہ نیاز فتحپوری نگار اپریل ۱۹۴۳ء)

"صادق الخیری کے تمام افسانے ہمارے اپنے ماحول، اپنے مسائل، اپنی مشکلات اپنے خیالات، اپنے دکھ درد اور اپنی خوشیوں کے جیتے جاگتے مرقعے ہیں، اور ان افسانوں میں حسن بیان اور حسن معنی دونوں خوبیاں بدرجۂ اتم موجود ہیں"

(مسٹر جلیل احمد قدوائی ایم اے)

"صادق الخیری کا تصور ہمہ گیر ہے، اور ان کے ہر قصہ میں ایک خاص خوبی پائی جاتی ہے۔ میں نے ان افسانوں کو بڑی دلچسپی سے پڑھا"

(خواجہ حسن نظامی دہلوی)